شکاری عورتیں

شکاری عورتیں

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور

ناشر . . . . نواز
مطبع . . . . ندرت پریس لاہور

فہرست

۱۔ میرٹھ کی قینچی ۷
۲۔ شکاری عورتیں ۲۶
۳۔ جنٹلمینوں کا برش ۳۶
۴۔ حجامت ۴۶
۵۔ مرزا غالب کی حشمت خاں کے گھر دعوت ۵۴
۶۔ لعنت ہے ایسی دوا پر ۶۴
۷۔ حج اکبر ۷۳
۸۔ اولاد ۸۷
۹۔ موچنا ۹۷
۱۰۔ نواب کاشمیری ۱۰۸
۱۱۔ لاؤڈ اسپیکر ۱۱۷

میرٹھ کی قینچی

"چل چل رے نوجوان" کی ناکامی کا صدمہ ہمارے دل و دماغ سے قریب قریب مندمل ہو چکا تھا۔ گیان مکرجی، فلستان کے لئے ایک پراپیگنڈہ کہانی لکھنے میں ایک عرصہ سے مصروف تھے۔

کہانی لکھنے اور اسے پاس کرانے سے پیش تر نلنی جیونت اور اس کے شوہر وریندر ڈیسائی (جس سے وہ اب طلاق لے چکی ہے) سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً" پچیس ہزار روپے میں۔ ایک سال اس معاہدے کی معیاد تھی۔ مسٹر ششودھر مکرجی، پروڈکشن کنٹرولر، حسب عادت سوچ بچار میں دس مہینے گذار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بصد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرض وجود میں آیا، جسے گیان مکرجی اپنے چرمی تھیلے میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے۔ تاکہ زبانی طور پر اس میں کچھ اور باتیں ڈال کر حکومت سے پاس کرالیں۔

خاکہ پاس ہو گیا۔ جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو وریندر ڈیسائی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے، اس لئے کہ

پہلے معاہدے کی معیاد ختم ہو رہی تھی۔ رائے بہادر چونی لال مینجنگ ڈائریکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمے بازی ہوئی۔ فیصلہ وریندر ڈیسائی اور اس کی خوبرو بیوی نلنی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پراپیگنڈا فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی بنا تھا' پچیس ہزار روپوں کے بوجھ تلے آگئی۔

رائے بہادر کو بہت عجلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو۔ کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا' جلدی جلدی وصی صاحب کو بلا کر ان کی بیوی ممتاز شانتی سے کنٹریکٹ کر لیا گیا اور اس کو چودہ ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیئے گئے۔ بلیک یعنی رسید کے بغیر۔

دو دن شوٹنگ ہوئی۔ ممتاز شانتی اور اشوک کمار کے درمیان مختصر سا مکالمہ تھا جو بڑی مین میخ کے بعد فلمایا گیا۔ مگر جب پردے پر اس ٹکڑے کو دیکھا گیا تو سب نے ممتاز شانتی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ ممتاز شانتی برقع پہن کر آتی تھی۔ اور ولی صاحب نے صاف الفاظ میں مکر جی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ واتھ نہ لگائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ممتاز شانتی کو فلم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے ادا کرنا ہے اس کے لئے وہ مناسب و موزوں نہیں۔ کیونکہ ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئین کو اپنے جسم کے بعض حصوں کی نمائش کرنا پڑے گی۔۔۔۔ قصہ مختصر کہ یہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ انتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ رائے بہادر چونی لال، لال پیلے ہو رہے تھے۔ "چل چل رے نوجوان" کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت پتلی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے کر گذارہ بڑی مشکل سے ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں، واچا، پائی اور اشوک اسٹوڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی ان ہی حماقتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا کہ اشوک نے یہ انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار روپے رائے بہادر نے ممتاز شانتی کو دیئے تھے، وہ انہوں نے اس سے قرض لئے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی پنڈلی کھجلاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً" چپ ہو گئے۔

سامنے بجری بچھی ہوئی روش پر ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھر کم ہیر ڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

رام داتا پائی نے اپنے کالے موٹے اور بدشکل ہونٹ کھولے اور خوفناک طور پر آگے بڑھے ہوئے اوندھے سیدھے میلے دانتوں کی نمائش کی اور واچا کو کہنی کا ٹھوکا دے کر اشوک سے مخاطب ہوا۔ "یہ--- یہ کون ہے؟"

واچا نے پائی کے سر پر ایک دھول جمائی۔ "سالے تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟"

پائی بدلہ لینے کے لئے اٹھا تو واچا نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ بیٹھ جا سالے۔ مت جا ادھر۔ تیری شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی"۔

پائی اپنے اوندھے سیدھے دانت پیستا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا "گڈ لکنگ ہے!"

میں نے ایک لحظہ کے لئے غور سے اس عورت کو دیکھا اور کہا "ہاں نظروں پر گراں نہیں گذرتی"۔

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا "کہاں سے نہیں گذرتی؟"

میں ہنسا۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ جو عورت یہاں سے گذر کر گئی ہے' اسے دیکھ کر آنکھوں پر بوجھ نہیں پڑتا۔ بڑی صاف ستھری۔۔۔ لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے"۔

پائی نے پھر اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی "ارے' چلے گی۔۔۔ کیوں واچا؟"

واچا! پائی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا۔ "دادامنی' تم جانتے ہو' یہ کون ہے؟"

اشوک نے جواب دیا۔ "زیادہ نہیں جانتا۔ مکر جی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عوامی ٹسٹ کے لئے آج آنے والی ہے"۔

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹسٹ کیا گیا۔ جسے ہم نے پردے پر دیکھا اور سنا اور اپنی اپنی رائے دی۔ مجھے' اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی جسمانی حرکات "چوبی" تھیں۔ اس کے اعضاء کی ہر جنبش میں

تصنع تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے آبرو پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح ناچتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی۔ لیکن پائی اس پر لٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی اور مکرجی سے کہا "ونڈر فل اسکرین فیس" ہے۔

دتا رام پائی فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر۔ فلمستان چونکہ ایسا ادارہ ہے جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہار رائے کی آزادی تھی' اس لئے دتا رام پائی وقت بے وقت اپنی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دو چار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لیکن ایس مکرجی نے اس عورت کو جس کا نام پارو تھا' پراپیگنڈہ فلم کے ایک رول کے لئے منتخب کر لیا چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً" اس سے ایک فلم کنٹریکٹ معمولی سی ماہانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارو ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا جہان وہ شہر کے قریب قریب ہر رنگین مزاج رئیس کی منظور نظر تھی۔ اس کو یہ لوگ میرٹھ کی قینچی کہتے تھے۔ اس لئے کہ وہ کاٹتی تھی اور بڑا مہین کاٹتی تھی۔

ہزاروں میں کھیلتی تھی۔ پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا جو اسے فلمستان لے آیا۔

جب اس سے کھل کے باتیں کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ

حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی اور جلد بھی' جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاوز میں اس کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتیں--- سفید' سڈول' متناسب اور خوبصورت۔ جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو "ولو" لکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

صبح اسٹوڈیو آئی' نہائی دھوئی۔ صاف ستھری' اجلی' سفید یا ہلکے رنگ کی ساری میں ملبوس۔ کسی صابن کا اشتہار معلوم ہوئی۔ شام کو جب گھر روانہ ہوتی تو دن گذرنے کے باوجود گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پر نظر نہ آتا۔ ویسی ہی ترو تازہ ہوتی۔ جیسی صبح کو ہوتی۔

دتا رام پائی اس پر اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی' اس لئے اسے فراغت ہی فراغت تھی۔ چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا--- معلوم نہیں وہ اس کے بھونڈے اور کرخت لہجے' اور اس کے اوندھے سیدھے میلے دانتوں اور اس کے ان کٹے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی--- صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے۔

پراپیگنڈہ فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ بڑے غور سے

اس کا مطالعہ کروں اور جو ترمیم و تنسیخ میری سمجھ میں آئے بیان کر دوں۔
میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہو سکے۔ کوئی سر تھا نہ پیر۔ چونکہ میری قابلیت کا امتحان تھا' اس لئے میں نے ایک اور ڈھانچہ تیار کیا' بڑے خلوص اور بڑی محبت سے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈائرکشن کے فرائض میرے کہنے پر ساوک واچا کو سونپے جانے والے تھے جو میرا عزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی "فل بنچ" کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہو سکتی ہے۔

ایس مکرجی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا۔ "ٹھیک ہے' مگر اس میں ابھی کافی اصلاح کی گنجائش ہے"۔

گیان مکرجی سے پوچھا گیا تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکوڑ کر صرف اتنا کہا "آل موسٹ ٹھیک ہے"--- یہ وہ حضرت تھے جو ایس مکرجی کے ڈائرکٹ کئے ہوئے تمام فلموں کے ڈائریکٹر کہلاتے تھے حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک فٹ فلم بھی ڈائرکٹ نہیں کی تھی۔

اصل میں فلمستان میں کام کرنے کا ڈھب ہی نرالا تھا۔ سارا فلم آپ نے ڈائرکٹ کیا ہے' لیکن پردے پر میرا نام دیا جا رہا ہے۔ کہانی میری ہے' لیکن اس کا مصنف آپ کو بنا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ دتا رام جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ "فلمی کہانی کیا ہوتی ہے' مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

پراپیگنڈا فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں وہی سمجھ سکتا ہے، جس نے کبھی ایسی کہانی لکھی ہو۔ سب سے زیادہ مشکل میری لئے یہ تھی کہ مجھے پارو کو، اس کی شکل و صورت، اس کے قد اور اس کی فنی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہرحال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے۔ کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل و دماغ سے کیمرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو، وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی۔ دتا رام پائی، اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پائی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی۔ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تمسخر اڑاتا۔ کم بخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا "سالے تو کیوں جلتا ہے"۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں، پارو بہت ہنس مکھ اور کھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن کے لئے وہ اونچ نیچ سے بے پروا بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً" پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات میں پارو کے بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتا رام پائی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا کچھ ایسی ٹپس لڑائی کہ

ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ پارو سے اپنی خاطر مدارات کرائی اور چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے ہفتے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ یہاں جادھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا مرد رہتا تھا۔ قد و قامت میں اس سے دوگنا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا۔۔۔ وہ اس کا پتی دیو کم اور "تھامو" زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

پائی ایسے فخر و ابتاج سے کنٹین میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آجاتی۔ میں اور ساوک واچا اس کا خوب مذاق اڑاتے، مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے خام اور بھونڈے عشق کا مذاق اڑاتا۔ پارو برا نہ مانتی اور مسکراتی رہتی۔ اس مسکراہٹ سے اس نے میرٹھ میں جانے کتنے دلوں کو اپنی قینچی سے کترا ہو گا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا بھڑکیلا یا چھچھورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرٹھ میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقہ سے تھا جو ناشائستگی کی طرف محض تفریح کی خاطر مائل ہوتا ہے۔

پارو اب اسٹوڈیو کی فضا میں بڑی اچھی خاصی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی ایکٹرس بنتی ہے،

تو اس کو کوئی نہ کوئی فوراً" دبوچ لیتا ہے' جیسے کہ وہ گیند ہے' جسے بلے کے ساتھ کسی نے ہٹ لگائی ہے۔ اور فیلڈ میں کھڑے کھلاڑی اس تاک میں ہیں کہ وہ ان کے ہاتھوں میں چلی آئے۔

لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک "پاکباز" تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پارو کو کوئی اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ (پراسرار نینا کا سابق خاوند) اپنی یک آہنگ' خشک مجرو زندگی سے اکتا کر پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی کے مانند سپاٹ تھی' شریک حیات بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسی غرض کے لئے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ ویرا فرسٹ کلاس میں آتی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کو "ایٹی کیٹ" کے مطابق آتے جاتے اس کی کتیا کی زنجیر تھامنا پڑتی۔۔۔ عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کتیا عزیز تھی۔

واچا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں کے بعد تازہ تازہ اپنی بدکار فرانسیسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ ایس مکرجی پری چہرہ نسیم بانو کے عشق کے چکر میں تھا۔ گیان مکرجی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک عورت سے شادی کر کے ہی بھرپایا تھا۔۔۔ اپنے متعلق میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پارو کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک دن میں نے شاہد لطیف (جو اب فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہے) سے اس کا ذکر کیا

تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "جلد بہت پسند ہے' ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے' مضمون کیسا ہے؟"

پائی کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ پارو نے ایک روز اسے گھر مدعو کیا تھا' اور اپنے ہاتھ سے اسے دو بیگ جونی واکر وسکی کے پلائے تھے۔ جب اس کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا' تو پارو نے اس کو بڑے پیار سے اپنے صوفے پر لٹا دیا تھا۔۔۔ اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے اور ہم لوگ چونکہ ناکام رہے ہیں' اس لئے حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ اس بارے میں پارو کا ردعمل کیا تھا' یہ مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی۔ ویرا فلم کی ہیروئن تھی۔ سائیڈ ہیروئین کا رول پارو کو ادا کرنا تھا۔ اسے برما سے کئی آزاد قبیلے کی ایک شوخ و شنگ' تیز طرار لڑکی کا روپ دھارنا تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر فلمائے جانے کا وقت آتا گیا، میرے اندیشے بڑھتے گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ امتحان میں پوری اترے گی' ہم سب کی کوفت کا موجب ہو گی۔

آخر وہ دن آگیا۔ جب اس کا پہلا "شوٹنگ ڈے" تھا۔ میک اپ اور کسٹیوم سے مزین ہو کر اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا۔ عجیب و غریب تراش کی بھڑکیلے رنگوں والی پھنسی پھنسی چولی۔ ناف سے اوپر پیٹ کی ہلکی سی جھلک۔ گھٹنوں سے بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے' مائک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً" مرعوب یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کروا دیا گیا تھا۔

امید تھی کہ بول جائے گی۔ مگر جب ”ٹیک“ کا وقت آیا تو اس کا سارا وجود لکڑی ہو گیا۔ منہ کھولا تو مکالمہ سپاٹ۔

کئی ریہرسلیں کرائی گئیں، مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح اپنے ابرو نچاتی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔ تین چار ”ری ٹیک“ ہوئے تو میں بالکل مایوس ہو گیا۔ واچا طبعاً بہت جلد گھبرا جانے والا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اونٹنی کی کوئی کل سیدھی نہیں تو ایس مکرجی سے کہا کہ وہ اسے ٹھیک کرے۔

مکرجی اسے کیا ٹھیک کرتے۔ وہ بنی ہی کچھ ایسے آب و گل سے تھی جس میں بناؤ، بھاؤ اور نرت کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ چنانچہ ایک ”ٹیک“ میں اس نے کسی قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکرجی نے غنیمت سمجھ کر صاد کر دیا۔

ہم سب نے بڑی کوشش کی کہ اس کا تصنع اور ”چوبی پن“ کسی نہ کسی طریقے سے دور ہو جائے، مگر ناکام رہے۔ شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نہ سدھری۔ اس کو کیمرے اور مائیک کا کوئی خوف نہیں تھا۔ مگر سیٹ پر وہ حسب منشاء اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی۔۔۔ اس کی وجہ میرٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ بہرحال اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز سمجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی، اس لئے میں نے اس کے ”رول“ میں کتر بیونت شروع کر دی تھی۔ میری اس چالاکی کا علم

اس کو پائی کے ذریعے سے ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خالی اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ گھنٹوں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ بڑے شائستہ انداز میں' مناسب و موزوں الفاظ میں جن میں چاپلوسی کا رنگ بظاہر نہ ہوتا' میری تعریف کرتی۔

ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر پر مدعو کیا۔ میں شاید چلا جاتا لیکن ان دنوں بہت مصروف تھا۔ ہر وقت میرے اعصاب پر پراپیگنڈہ فلم کا منظر نامہ سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بٹانے کے لئے تین آدمی موجود تھے۔ راجہ مہدی علی خاں' محسن عبداللہ اور ڈکشٹ۔

راجہ مہدی علی خاں نے تعاون سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ محسن عبداللہ' ویرا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مصروف تھے' اور مسٹر ڈکشٹ پارو کو مکالے یاد کراتے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آمنے سامنے آتے ہیں تو اشوک سے پارو کو اپنے جارہانہ عشق کا اظہار کرنا ہوتا ہے' تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑ جانا چاہتی ہیں۔ جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے' جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً" بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت سے کھلم کھلا اظہار عشق نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے۔ لیکن اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر

لیتا۔

اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لڑکیاں آئیں۔ وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا' مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانے والی تتلیوں کو ناامید کرتا رہا۔

اشوک کمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی بھی ایکٹرس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ بڑی آسانی سے کئی ایکٹرسیں اپنا دل اس کے قدموں میں پائنداز کی طرح بچھانے کے لئے تیار تھیں۔ میں نے سوچا' اگر پارو کے دل میں بھی کھدبد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔۔۔ پھر پارو نووارد تھی۔ خود کو اشوک کے ساتھ منسلک کر کے وہ بام شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کی نیم جنگلی' خود سر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی' مگر وہ ویرا کے عشق میں گرفتار تھا۔ یہ فلمی تثلیث پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کافی سامان بہم پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی۔۔۔ ان ڈور' آوٹ ڈور۔ ایک دن کشتیوں کا سین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لئے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک کمار کو سوار ہونا تھا' دوسری میں پارو کو۔ اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی' اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا۔ حسب ہدایت پارو' اشوک کمار کی کشتی میں کودی'

مگر ایسا کرتے ہوئے دونوں کشتیوں میں فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا' اور وہ پانی میں گر پڑی۔ واچا مدد کے لئے چلایا۔ فوراً" ساحل پر سے دو تین مچھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے پانی سے باہر لے آئے۔

عورت زاد' مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہ کیا۔ کپڑے خشک ہوئے تو وہ دوسرے ٹیک کے لئے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ایک ٹانگ کی جھلک دیکھی جو کافی دلچسپ اور شریر تھی۔

جب ہم لوکیشن سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روزانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا۔ "منٹو---- پارو کی ٹانگ بڑی اچھی تھی---- جی چاہتا تھا' روسٹ بنا کے کھا جاؤں"۔

عجیب بات ہے کہ اشوک ایسا ڈرپوک اور جھینپو اندرونی طور پر سادیت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ اپنے خیالات دبا دینے کا عادی تھا' اس لئے ردعمل کی صورت میں یہ سادیت پیدا ہو گئی تھی۔

ٹوسٹڈ۔ ایم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹوڈیو سے گھر واپس جایا کرتے' اور راستے میں ادھر ادھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے۔ موٹر اس سڑک پر سے بھی گذرتی تھی جس ملحقہ گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گذرے تو تھوڑی دور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے"۔

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آج ہولی کی خوشی

میں پارو نے دعوت دی ہے۔ جاؤں یا نہ جاؤں"۔

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے "جاؤ!"

"تو چلو تم بھی چلو"۔

میں نے کہا۔ "میں کیوں چلوں۔ مجھے اس نے مدعو نہیں کیا"۔

"کوئی بات نہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی' اور پارو کے فلیٹ کے پاس بریک لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی میں واچا اور پائی نمودار ہوئے"۔

پائی نے مجھے دیکھا تو اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "ارے تم بھی آگئے؟"

واچا نے اشوک سے کہا "آؤ' دادامنی آؤ۔ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا"۔

پارو خلاف معمول پارسی ساڑھی میں ملبوس دلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں معذرت کی کہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی۔

فوراً" شراب کا دور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پائی جھومنے لگا۔ واچا نے فرمائش کی کہ ایک آدھ گانا ہو جائے۔ پارو نے کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں اشوک صاحب آپ کچھ سنیں گے"۔

اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ سکا "آپ گائیں گی تو میں سنوں گا"۔

گانا شروع ہوا۔ بازاری قسم کی ٹھمری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل شروع ہوئی۔ پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر یا جو کوئی بھی وہ تھا' گلاسوں میں شراب اور سوڈا انڈیلتا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پائی کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں اس لئے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ واچا نے تیسرے کے بعد اپنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

ٹھمریاں' غزلیں' گیت بہت دیر تک ہوتی رہیں۔ آخر میں جب اس نے بھجن سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کر کے ایک نعت شروع کی۔ لیکن میں نے فوراً اس کو روک دیا۔ "پارو دیوی' یہ محفل نشاط ہے--- شراب کے دور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے"۔

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معافی کی طلب گار ہوئی۔

کھانا بہت اچھا تھا--- اشوک جلدی سے فارغ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دھلوانے کے لئے پارو اٹھی--- جب اشوک واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔

راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گذر گئے۔ شوٹنگ بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی۔ ایک شام جب میں اور اشوک واپس جا رہے تھے تو شیوا جی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا' اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''منٹو'' تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں''۔ اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لحظہ کے لئے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے۔

''بتاؤ''۔

اشوک ہنسنے لگا کہ تمہیں یاد ہے اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے تو وہ میرے ہاتھ دھلوانے کے لئے اٹھی تھی''۔

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آگئی۔ ''ہاں ہاں''۔

''جب غسل خانے میں مجھے اس نے تولیہ دیا تو آہستہ سے کہا۔ کل آپ اکیلے آیئے--- شام کو ساڑھے چھ بجے--- میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا''۔

اس نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھہرا لی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم گئے''۔

''ہاں'' اشوک نے اسٹیرنگ وہیل سے ہاتھ اٹھائے اور انہیں زور زور سے ملنے لگا۔ ''لیکن بھاگ گیا''۔

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ ''ہوا کیا--- پورا سینریو بتاؤ''۔

''میں بڑا ڈرپوک ہوں--- جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے--- اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا' اور آپ قالین پر میرے ساتھ لگ

کر بیٹھ گئی۔ دو پیگ مجھے پلائے۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر--- وہ لگی اپنی محبت جتانے--- میں سنتا رہااور کانپتا رہا۔ جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا--- اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن فوراً" کہیں غائب ہو گئے--- وہ مسکرانے لگی--- بھیا اشوک! --- میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی--- میں نے یہ سنا تو چکرا گیا۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا۔ اشوک صاحب! --- میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں--- میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا--- کار میں بیٹھا--- گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے گذرے ہوئے واقعہ پر بڑا افسوس ہوا۔ کیا حرج تھا۔ اگر میں---؟"

اشوک کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں نے کہا "ہاں کوئی حرج نہیں تھا"۔

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا۔

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آگیا جو اس وقوع کے روز رات کے نو بجے اسٹوڈیو سے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشن مسرت میں لوگ ناچ رہے تھے--- اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے محو رقص تھا' اور پارو ایک طرف مجسمہ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی۔

شکاری عورتیں

میں آج آپ کو چند شکاری عورتوں کے قصے سناؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی کبھی ان سے واسطہ پڑا ہو گا۔

میں بمبئی میں تھا۔ فلمستان سے عام طور پر برقی ٹرین سے چھ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ لیکن اس روز مجھے دیر ہو گئی۔ اس لئے کہ "شکاری" کی کہانی پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

میں جب بمبئے سنٹرل کے اسٹیشن پر اترا' تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے باہر نکلی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ جوان تھی۔ اس کی چال بڑی انوکھی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ فلم کا منظر نامہ لکھ رہی ہے۔

میں اسٹیشن سے باہر آیا اور پل پر وکٹوریا گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ میں تیز چلنے کا عادی ہوں اس لئے میں دوسرے مسافروں سے بہت پہلے باہر نکل آیا تھا۔

وکٹوریا آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے کوچوان سے کہا کہ

آہستہ آہستہ چلے اس لئے کہ فلمستان میں کہانی پر بحث کرتے کرتے میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وکٹوریا والا آہستہ آہستہ پل پر سے اترنے لگا۔

جب ہم سیدھی سڑک پر پہنچے تو ایک آدمی سر پر ٹاٹ سے ڈھکا ہوا مٹکا اٹھائے صدا لگا رہا تھا۔ "قلفی---- قلفی!"

جانے کیوں میں نے کوچوان سے وکٹوریہ روک لینے کے لئے کہا، اور اس قلفی بیچنے والے سے کہا کہ ایک قلفی دو---- میں اصل میں اپنی طبیعت کا تکدر کسی نہ کسی طرح دور کرنا چاہتا تھا۔

اس نے مجھے ایک دونے میں قلفی دی۔ میں کھانے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی دھم سے وکٹوریا میں آن گھسا۔ کافی اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہی گہرے رنگ کی سانولی لڑکی تھی۔

میں بہت گھبرایا---- وہ مسکرا رہی تھی۔ دونے میں میری قلفی پگھلنا شروع ہو گئی۔

اس نے قلفی والے سے بڑے بے تکلف انداز میں کہا "ایک مجھے بھی دو"۔

اس نے دے دی۔

گہرے سانولے رنگ کی لڑکی نے اسے ایک منٹ میں چٹ کر دیا اور وکٹوریا والے سے کہا "چلو"۔

میں نے اس سے پوچھا "کہاں؟"

"جہاں بھی تم چاہتے ہو"۔

"مجھے تو اپنے گھر جانا ہے"۔

"تو گھر ہی چلو"۔

"تم ہو کون؟"

"کتنے بھولے بنتے ہو"۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا "گھر جانا ٹھیک نہیں--- اور یہ وکٹوریہ بھی غلط ہے--- کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں"۔

وہ میرے اس مشورے سے بہت خوش ہوئی--- میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں--- اسے دھکا دے کر باہر نکالتا تو اودھم مچ جاتا۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ عورت ذات ہے اس سے فائدہ اٹھا کر کہیں وہ یہ واویلا نہ مچا دے کہ میں نے اس سے ناشائستہ مذاق کیا ہے۔

وکٹوریا چلتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ مصیبت کیسے ٹل سکتی ہے آخر ہم بے بی ہسپتال کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ میں نے وکٹوریہ والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور ایک ٹیکسی لے لی۔ ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے۔

ڈرائیور نے پوچھا "کدھر جانا ہے صاحب؟"

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے اس

سے زیر لب کہا۔ ''مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے--- یہ لو دس روپے---
اس لڑکی کو تم جہاں بھی لے جانا چاہو لے جاؤ''۔

وہ بہت خوش ہوا۔

دوسرے موڑ پر اس نے گاڑی ٹھہرائی اور مجھ سے کہا ''صاحب آپ
کو سگریٹ لینے تھے--- اس ایرانی کے ہوٹل سے سستے مل جائیں گے''۔

میں فوراً'' دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ گہرے رنگ کی لڑکی نے کہا۔ ''دو
پیکٹ لانا''۔

ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا۔ ''تین لے آئیں گے''۔ اور اس نے
موٹر اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

بمبئی ہی کا واقعہ ہے میں اپنے فلیٹ میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میری بیوی
شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹن جو بڑے تیکھے نقشوں والی تھی
بے دھڑک اندر چلی آئی۔ میں نے سوچا شاید نوکری کی تلاش میں آئی ہے۔
مگر وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی--- میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ
نکالا اور اسے سلگا کر مسکرانے لگی۔

میں نے اس سے پوچھا ''کون ہو تم؟''

''تم پہچانتے نہیں''۔

''میں نے آج پہلی دفعہ تمہیں دیکھا ہے''۔

''سالا جھوٹ مت بولو--- دو روز دیکھتا ہے''۔

میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔۔۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرا نوکر فضل دین آگیا۔۔۔ اس نے اس تیکھے نقشوں والی گھاٹن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

یہ واقعہ لاہور کا ہے۔

میں اور میرا ایک دوست ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے۔ جب ہمارا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس پہنچا تو ایک تانگہ ہمارے عقب سے نکل کر آگے آگیا۔ اس میں ایک برقع پوش عورت تھی جس کی نقاب نیم وا تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت ناچنے لگی۔ میں نے اپنے دوست سے جو پچھلی نشست پر بیٹھا تھا' کہا۔ یہ عورت بدچلن معلوم ہوتی ہے"۔

"تم ایسے فیصلے ایک دم مت دیا کرو"۔

"بہت اچھا جناب۔۔۔ میں، آئندہ احتیاط سے کام لوں گا"۔

برقع پوش عورت کا تانگا ہمارے تانگے کے آگے آگے تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں بڑا بزدل ہوں' لیکن اس وقت مجھے شرارت سوجھی اور میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آداب عرض کر دیا۔

اس کے آدھ ڈھکے چہرے پر مجھے کوئی ردعمل نظر نہ آیا جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔

میرا دوست گنگنانے لگا۔ اس کو میری اس ناکامی سے بڑی مسرت ہوئی۔

لیکن جب ہمارا ٹانگہ شملہ پہاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا تو برقع پوش عورت نے اپنا ٹانگہ ٹھہرا لیا اور (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے ٹانگے میں بیٹھ گئی--- میرے دوست کے ساتھ۔

میری سمجھ میں نہ آیا کیا کیا جائے۔ میں نے اس برقع پوش عورت سے کوئی بات نہ کی' اور ٹانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رخ کرے۔

میں اسے اندر لے گیا--- ڈائریکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ "یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی۔ آپ کے پاس لے آیا ہوں' اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں یہاں کوئی کام دلوا دیجیے"۔

انہوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا۔ جب وہ آڈیشن دے کر آئی تو اس نے برقع اتارا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس کے قریب ہو گی۔ رنگ گورا آنکھیں بڑی بڑی۔ لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے شکر قندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چپڑاسی آیا۔ اس نے کہا کہ باہر ایک ٹانگہ والا کھڑا ہے' وہ کرایہ مانگتا ہے۔ میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گذرنے پر وہ تنگ آگیا ہے' چنانچہ میں باہر نکلا۔ میں نے اپنے تانگے والے

سے پوچھا "بھئی کیا بات ہے۔ ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے"۔

وہ بڑا حیران ہوا "کیا بات ہے سرکار"۔

"تم نے کہلا بھیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو"۔

"میں نے جناب کسی سے کچھ بھی نہیں کہا"۔

اس کے تانگے کے ساتھ ہی ایک دوسرا تانگہ کھڑا تھا۔ اس کا کوچوان جو گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا' میرے پاس آیا اور کہا "وہ عورت جو آپ کے ساتھ گئی تھی' کہاں ہے؟"

"اندر ہے --- کیوں؟"

"جی اس نے دو گھنٹے مجھے خراب کیا ہے --- کبھی ادھر جاتی تھی' کبھی ادھر --- میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے"۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"جی میں اپنا کرایہ چاہتا ہوں"۔

"میں اس سے لے کر آتا ہوں"۔

میں اندر گیا --- اس برقع پوش عورت سے جو اپنا برقع اتار چکی تھی کہا۔ "تمہارا تانگے والا کرایہ مانگتا ہے"۔

وہ مسکرائی "میں دے دوں گی"۔

میں نے اس کا پرس جو صوفے پر پڑا تھا' اٹھایا۔ اس کو کھولا --- مگر اس میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ بس کے چند ٹکٹ تھے اور دو بالوں کی

"نہیں--- اور ایک واہیات قسم کی لپ اسٹک۔

میں نے وہاں ڈائریکٹر کے دفتر میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے رخصت طلب کی۔ باہر آکر اس کے تانگے والے کو دو گھنٹوں کا کرایہ ادا کیا' اور اس عورت کو اپنے دوست کی موجودگی میں کہا' تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہئے تھا کہ تم نے تانگہ لے لیا ہے اور تمہارے پاس ایک کوڑی بھی نہیں"۔

وہ کھسیانی ہو گئی "میں--- میں--- آپ بڑے اچھے آدمی ہیں"۔

"میں بہت برا ہوں--- تم بڑی اچھی ہو--- کل سے ریڈیو اسٹیشن آنا شروع کر دو--- تمہاری آمدن کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ یہ بکواس جو تم نے شروع کر رکھی ہے' اسے ترک کرو"۔

میں نے اسے مزنگ کے پاس چھوڑ دیا--- میرا دوست واپس چلا گیا--- اتفاقاً" مجھے ایک کام سے وہاں جانا پڑا۔

دیکھا کہ میرا دوست اور وہ عورت اکٹھے جا رہے تھے۔

یہ بھی لاہور ہی کا واقعہ ہے۔

چند روز ہوئے' میں نے اپنے دوست کو مجبور کیا کہ وہ مجھے دس روپے دے۔ اس دن بنک بند تھے۔ اس نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن جب میں نے اس پر زور دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ دس روپے پیدا کرے۔ اس لئے کہ مجھے اپنی ایک علت پوری کرنا ہے' جس سے تم بخوبی

واقف ہو' تو اس نے کہا "اچھا" میرا ایک دوست ہے وہ غالباً" اس وقت کافی ہاؤس میں ہو گا۔ وہاں چلتے ہیں امید ہے کام بن جائے گا۔

ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر کافی ہاؤس پہنچے۔ مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک ٹانگہ جا رہا تھا۔ اس میں ایک نسواری رنگ کا برقع پہنے ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس کی نقاب پوری کی پوری اٹھی ہوئی تھی--- وہ ٹانگے والے سے بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ہمیں اس کے الفاظ سنائی نہیں دیئے۔ لیکن اس کے ہونٹوں کی جنبش سے جو کچھ مجھے معلوم ہونا تھا ہو گیا۔

ہم کافی ہاؤس پہنچے تو عورت کا تانگہ بھی وہیں رک گیا۔ میرے دوست نے اندر جا کے دس روپوں کا بندوبست کیا اور باہر نکلا--- وہ عورت نسواری برقعے میں جانے کس کی منتظر تھی۔

ہم واپس گھر آنے لگے تو رستے میں خربوزوں کے ڈھیر نظر آگئے۔ ہم دونوں تانگے سے اتر کر خربوزے پرکھنے لگے۔

ہم نے باہم فیصلہ کیا کہ اچھے نہیں نکلیں گے کیونکہ ان کی شکل و صورت بڑی بے ڈھنگی تھی--- جب اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی نسوانی برقع تانگے میں بیٹھا خربوزے دیکھ رہا ہے۔

میں نے اپنے دوست سے کہا "خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے--- آپ نے ابھی تک یہ نسواری رنگ نہیں پکڑا"۔

اس نے کہا "ہٹاؤ جی--- یہ سب بکواس ہے"۔

ہم وہاں سے اٹھ کر تانگے میں بیٹھے۔ میرے دوست کو قریب ہی ایک کیمسٹ کے ہاں جانا تھا۔ وہاں دس منٹ لگے۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ نسواری برقع اسی تانگے میں بیٹھا جا رہا تھا۔

میرے دوست کو بڑی حیرت ہوئی "یہ کیا بات ہے؟ —— یہ عورت کیوں بیکار گھوم رہی ہے؟؟"۔

میں نے کہا "کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہو گی"۔

ہمارا تانگہ ہال روڈ کو مڑنے ہی والا تھا کہ وہ نسواری برقع پھر نظر آیا۔ میرے دوست گو کنوارے ہیں، لیکن بڑے زاہد۔ ان کو جانے کیوں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ اس نسواری برقعے سے بڑی بلند آواز میں کہا۔ "آپ کیوں آوارہ پھر رہی ہیں —— آیئے ہمارے ساتھ"۔

اس کے تانگے نے فوراً رخ بدلا اور میرا دوست سخت پریشان ہو گیا۔ جب وہ نسواری برقع ہم کلام ہوا تو اس نے اس سے کہا "آپ کو تانگے میں آوارہ گردی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

میرے دوست نے اس نسواری برقعے سے شادی کر لی۔

جنٹلمینوں کا برش

یہ غالباً" آج سے بیس برس پیچھے کی بات ہے۔ میری عمر یہی کوئی بائیس برس کے قریب ہو گی' یا شاید اس سے دو برس کم۔ کیونکہ تاریخوں اور سنوں کے معاملے میں میرا حافظہ بالکل صفر ہے۔ میری دوستی کا حلقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔

حفیظ پینٹر کی دکان میں جو بجلی والے چوک سے بائیں ہاتھ ہال بازار کے پاس ہی واقع تھی' ہم سب بیٹھتے اور گھنٹوں گپ بازی ہوتی رہتی۔ میں پڑھائی وڑھائی قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اسی طرح مبارک اپنی ملازمت پر لات مار کر امرتسر واپس چلا آیا تھا۔ وہ کسی ریاست میں ملازم تھا۔ حفیظ پینٹر کی اپنے باپ سے جخ ہو گئی تھی' اس لئے اس نے علیحدہ ایک بڑی دکان جس میں کچھ عرصہ پہلے ایک کمیونسٹ سکھ کی دکان تھی' جو گراموفون ڈیلر تھا۔ خیر دین کی مسجد سے ملحقہ دکان ہال بازار میں تھی مگر اچھے موقع پر تھی۔ یعنی عین ہال بازار کے وسط میں اور مسجد کے زیر سایہ خرابات مروجہ اصولوں کے ماتحت ہونی ہی چاہئے۔ اس لئے وہ اسے بہت پسند آگئی تھی۔

ادھر ازان ہوتی تو ادھر ریکارڈ بجتے۔ لیکن کوئی دنگہ فساد اس بات پر وہاں کبھی نہ ہوا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سینکڑوں خون ہوتے رہتے۔

امرو پرستی پر' رنڈی بازی پر' گنڈوں کی دو مخالف پارٹیوں پر' ایسے مسلم مسلم اور مسلم ہندو فساد عام تھے۔ جو ایک دو دن اپنی دھاک بٹھا کر جھاگ کے مانند غائب ہو جاتے۔ گرمی کی پہلی پیلی بھڑوں کے مانند جو اپنے ارد گرد جالا تن لیتی ہیں اور بظاہر بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں پھر موافق موسم آنے پر زندہ ہو جاتی ہیں' اور بے قصور آدمیوں کو کاٹنے کے شغل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

امرتسر ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ یہاں ہر ایک قسم کی شے اس زمانے میں پائی جاتی تھی۔ بھنگنوں کی لڑائی سے لے کر گورنمنٹ سے پنجہ کشی کرنے تک۔ لوگ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ لالے جو اپنی بزازی کی دکانوں پر پادتے رہتے اور کچھ ایسے من چلے بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے پٹاخے بنا کر چلاتے تھے کہ لوگوں کے دل ایک لحظے کے لئے دہل جاتے۔ دہشت پسند بھی تھے اور امن پسند بھی۔ نمازی اور پرہیزگار تھے اور اول درجے کے اوباش اور گناہ گار بھی۔ مسجدیں تھیں اور مندر بھی۔ ان میں گناہ کے کام بھی ہوتے تھے اور ثواب کے بھی۔

غرضیکہ انسانی زندگی کے یہ سب دھارے ساتھ ساتھ متواتر بہا کرتے تھے۔۔۔ کئی سیاسی تحریکیں ہوئیں۔ کئی گنڈوں کا آپس میں کشت خون ہوا۔ مسلمانوں اور قادیانیوں میں کئی مباہلے ہوئے' جن میں بڑی جغادری علمائے

کرام نے حصہ لیا۔ قحط پڑے' وبائیں آئیں۔ جلیاں والا کا تاریخی حادثہ ہوا' ہزاروں انسان' جن میں مسلمان' سکھ' ہندو سب شامل تھے' موت کے گھاٹ اتارے گئے' لیکن امرتسر جوں کا توں رہا۔

حفیظ پینٹر کی دکان پر یوں تو دنیا بھر کے سیاسی' مجلسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیالات اور بحث ہوتی رہتی' مگر بڑے خام انداز میں۔ اصل میں وہ سب کے سب آرٹسٹ تھے۔ گونیم رس ـــ ان کو دراصل موسیقی سے شغف تھا۔ کوئی طبلے کی جوڑی اٹھالیتا' کوئی ستار' کوئی سارنگی اور کوئی تانبورہ ہاتھ میں لے کر میاں کی ٹوڈی' مالکونس یا بھاگیری کا الاپ شروع کر دیتا۔

یہاں بھانگ بھی گھوٹی جاتی' چرس بھرے سگریٹ بھی پیئے جاتے شراب کے دور اکثر چلتے' اس لئے کہ دن اتنا بڑا بے باک نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ روپے میں ایک پوری بوتل بڑھیا سے بڑھیا اسکاچ وسکی کی آجاتی تھی۔ حفیظ شام کو اپنی دکان کے بھاری بھرکم کواڑ بند کر دیتا اور ہم چٹائیوں پر بیٹھ کر اس مشروب سے آہستہ آہستہ لطف اندوز ہوتے۔ پھر آدھی رات کو جب آس پاس کی ساری دکانیں بند ہوتیں' ہم موسیقی کا دور شروع کر دیتے۔

یہاں قریب قریب سب گویئے' بڑے اور چھوٹے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس لئے کہ زندہ دل نوجوانوں کی محفل تھی۔ پھکڑ بازی بھی ہوتی تو کوئی برا نہ مانتا تھا۔

ایک دن میں صبح دس بجے کے قریب حفیظ پینٹر کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس لئے کہ مجھے ذرا آگے چل کر ایک کیمسٹ کی دکان سے اپنے کان کے لئے دوا لینا تھی کہ حفیظ نے برش کان میں اڑس کر مجھے باآواز بلند پکارا اور اسی کان میں اڑے ہوئے برش کو نکال کر اس سے مجھے اشارہ کیا' جس کا یہ مطلب تھا کہ میں اس کی بات سنتا جاؤں۔

میں اس کی دکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا' اور اس سے پوچھا "کیا بات ہے حفیظ صاحب؟؟"

حفیظ نے برش پھر کان میں اڑس لیا اور جواب دیا "بات یہ ہے میری جان کہ آج توکل کا گانا ہو گا۔ اس کے ساتھ مچھر خان اور بسے خان بھی ہوں گے ــــ وہ معاملہ بھی ہو گا ــــ چھ بجے سے پہلے پہلے ہی آجانا ــــ میں نے تمام دوستوں کو اطلاع دے دی ہے۔ توکل کو میں نے سنا تو نہیں لیکن نئے خیال کے لوگ اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ نوجوان ہے۔ کہتے ہیں کہ خاں صاحب عاشق کے مانند بے ڈار گاتا ہے اور حق ادا کرتا ہے"۔

میں بہت خوش ہوا' "آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ مگر یہ مچھر خان کیا بلا ہے ــــ کیا تم اسے کسی مچھردانی کے اندر بٹھاؤ گے؟؟"

حفیظ پینٹر کھلکھلا کر ہنسا "ارے نہیں یار' اس کی عادت ہے کہ جب کوئی تان لیتا ہے اور واپس سم پر آتا ہے اور بڑے زور سے اپنی رانوں پر دوہتڑ مارتا ہے ــــ اس لئے اس کا نام مچھر خان پڑ گیا ہے۔ جیسے وہ گا نہیں رہا' بلکہ اپنے بدن پر کاٹنے والے مچھر مار رہا ہے"۔

میں نے اس سے کہا "چلو' اس کا تماشہ بھی دیکھ لیں گے۔۔۔ پر اگر اس نے آج رات کوئی مچھر نہ مارا تو یہ طے ہے کہ تمہارے آرٹ اسٹوڈیو سے وہ زندہ باہر نہیں نکلے گا"۔

حفیظ کھلکھلا کر ہنسا' کان میں سے اڑسا ہوا برش نکالا اور سائن بورڈ پینٹ کرنے لگا "جاو یار جاؤ۔۔۔ میرا وقت ہرج کر رہے ہو۔۔۔ مجھے یہ کام وقت پر مکمل کرنا ہے"۔

میں وہاں سے چلا گیا۔۔۔ کیمسٹ کی دکان سے دوائی لی۔ باہر نکلا تو شیخ صاحب جو وہاں کے بہت بڑے رئیس تھے' ان سے دو آدمی دکان کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے شیخ صاحب کو سلام کیا۔۔۔ انہوں نے جیسا کہ ان کی عادت تھی' چھڑی بجلی کے کھمبے کے ساتھ ماری۔ جب آواز پیدا ہوئی تو ان کا اطمینان ہو گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "کہو بھئی سعادت کیا حال ہے"۔

میں نے عرض کی "جناب کی دعا سے سب ٹھیک ہے"۔

جن دو آدمیوں سے شیخ صاحب باتیں کر رہے تھے' وہ سیاہ فام تھے' لیکن اچکن کا رنگ ان کے رنگ سے کہیں زیادہ کالا۔

دبلا پتلا' لیکن چہرے کے نقش تیکھے۔ شیخ صاحب چلنے لگے تو اس آبنوسی گوشت پوست کے ٹکڑے نے تیزی سے بڑھ کر شیخ صاحب کے کوٹ کی پیٹھ جھاڑنی شروع کی' بڑی نفاست سے' شیخ صاحب نے گرما کر اس سے پوچھا "کیا بات تھی؟"

اس آبنوسی آدمی نے بڑی پتلی آواز میں جواب دیا "چند بال تھے اور تھوڑی سی گرد"۔

شیخ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا "اچھا تم کل صبح گھر پہ آنا" اور وہ پھر بجلی کے کھمبے کو اپنی چھڑی سے بجاتے ہوئے غالباً" کمپنی باغ کی طرف نکل گئے۔

ایک دن میں نے پھر اسے دیکھا۔ اپنے کٹڑے کے بازار میں وہ دو لالوں کی مصاحبی میں مصروف تھا۔ اس نے صاف ستھرے کوٹوں پر سے کئی مرتبہ غیر مرئی چیزیں جدا کیں۔ اس دن بھی وہ اپنی کالی اچکن پہنے تھا۔ حالانکہ کالے کپڑے پر گرد و غبار فوراً" نمایاں ہوتا ہے' مگر میں نے غور سے دیکھا' کہ اس پر ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ جنٹل مینوں کے برش کے علاوہ اپنا برش خود بھی تھا۔

مجھے راستے میں ایک دوست مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ آبنوسی آدمی کون ہے؟"۔

اس نے حیرت سے پوچھا "کون سا آبنوسی آدمی --- بن مانس سنے تھے' مگر آبنوسی کہاں سے تم نے گھڑ لیا"۔

میں نے اس سے ذرا تیز لہجے میں کہا "ارے یہ آدمی جو ہمارے آگے آگے جا رہا ہے--- چغد ہو پرلے درجے کے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آبنوس ایک لکڑی ہوتی ہے"۔

"تو کیا یہ لکڑی ہے جو چل پھر رہی ہے؟"۔

"ابے نہیں۔۔۔ آبنوس کا رنگ کالا ہوتا ہے' چونکہ اس نے کالی اچکن پہنی ہے اور رنگ بھی اس کا خدا کے فضل و کرم سے خاصا کالا ہے' تو میں نے اسے آبنوسی آدمی کہہ دیا"۔

میرا دوست ہنسا "ارے' تم اسے نہیں جانتے' اس کا نام جنٹل مینوں کا برش ہے"۔

"اتنا تو میں جانتا ہوں"۔

"تو اس سے زیادہ تم اور کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"میں نے چڑ کر کہا "یہی کہ اس کا محل وقوع کیا ہے۔۔۔ اس کا پیشہ کیا ہے؟"

میرا دوست مسکرایا "یہ ذات کا ربابی ہے' جو دربار صاحب میں چوکی کرتے ہیں۔۔۔ مگر یہ وہاں نہیں جاتا۔۔۔"

"کیوں؟"

"بس اس کو امیروں کی صحبت حاصل ہے۔ ان میں ہی اٹھتا بیٹھتا ہے' اور ان کے کوٹوں پر برش کرتا رہتا ہے"۔

میں نے اس سے پوچھا "کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟"

جواب ملا "جن کی مصاحب داری کرتا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ گاتا بہت اچھا ہے"۔

میں نے پوچھا "تم نے کبھی سنا ہے اس کو؟"

"نہیں' البتہ تعریف بہت سنی ہے"۔

ہم باتوں میں مشغول پیچھے رہ گئے اور وہ جنٹل مینوں کا آبنوسی برش ان دو لالوں کے کوٹ جھاڑتا بہت دور نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا دوست بھی مجھ سے جدا ہو گیا۔ اس کو کوئی ضرر کام تھا ورنہ میں اس شخص کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرتا۔

اتفاق سے مجھے اپنے بہنوئی (جو امرتسر کے آنریری مجسٹریٹ تھے اور خدا معلوم کیا کیا تھے) کے ساتھ ایک تقریب پر جانا پڑا۔ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ تقریب تھی جو نئے ڈپٹی کمشنر کے تقرر کے سلسلے میں تھی۔ وہ شخص وہی کالی اچکن پہنے معزز اور رئیس لوگوں کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ اس نے بلامبالغہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر چن چن کر کئی رؤسا کے کوٹ صاف کیے۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے۔ کسی کے کالر پر سے اس نے بال اٹھائے، کسی کے کوٹ کی پیٹھ پر سے۔۔۔ بعضوں کے کوٹوں کو، جب اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ گرد اپنے رومال سے جھاڑ دی اور ہر ایک سے شکریہ وصول کیا۔

بڑی جرات سے کام لے کر وہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس بھی جا پہنچا، اور اس کی پتلون صاف کر دی۔ وہ انگریز تھا۔ اس نے جنٹل مینوں کے برش کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ایک رات جب کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی اور حفیظ پینٹر کی دکان میں ہم معشوق علی فوٹوگرافر سے اس کا گانا سن کر محظوظ ہو رہے تھے، اور ساتھ ساتھ وسکی بھی پی رہے تھے، کہ اچانک دکان کا پھاٹک

نما دروازہ کھلا اور جنٹل مینوں کا برش نمودار ہوا۔ اس نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا "میں ادھر سے گذر رہا تھا کہ گانے کی آواز سنائی دی--- ماشاء اللہ بڑی سریلی تھی--- ہے تو یہ تہذیب کے خلاف کہ میں بن بلائے چلا آیا--- اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا تھوڑی دیر کے لئے آپ کی محفل میں شریک ہو سکتا ہوں"۔

حفیظ پینٹر اور معشوق علی فوٹو گرافر بیک وقت بولے "ہاں' ہاں تشریف رکھیے"۔

مبارک نے کہا' سر آنکھوں پر--- یہاں میرے پاس بیٹھیے--- آپ تو خود بڑے معرکے کے گانے والے ہیں--- کچھ نوش فرمایئے گا"۔

مبارک کی مراد وسکی سے تھی' مگر جنٹل مینوں کے برش نے بڑی شائستگی سے کہا "جی نہیں--- میں اس نعمت سے محروم ہوں"۔

سب کے اصرار پر اس نے گانا شروع کیا۔ میاں کی ٹوڈی تھی جو اس نے ایسی خوش الحانی سے گائی کہ مزے آگئے۔ اس کے بعد اس نے اجازت چاہی--- سب نشے میں چور تھے' اس لئے ان کو یہ خبر نہیں تھی کہ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے--- لیکن جب جنٹل مینوں کے برش نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا "حضور، باہر بہت بارش ہو رہی ہے' کیسے جایئے گا"۔

آبنوسی برش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "آپ فکر نہ کریں' ابھی لالہ جگت نارائن کمبل والے کی گاڑی مجھے لینے کے لئے آجائے

گی۔۔۔ آپ اپنا شغل جاری رکھئے۔۔۔ شکریہ!"۔

یہ کہہ کر اس نے دکان کا پھاٹک نما دروازہ بند کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد بارش تھمی تو محفل برخاست کر دی گئی۔۔۔ باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ کوئی آدمی بدرو میں اوندھے گرا پڑا ہے۔۔۔ میں نے غور سے دیکھا تو چلایا "ارے یہ تو وہی جنٹل مینوں کا برش ہے"۔

حفیظ نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا "جنٹل مینوں کی ایسی تیسی۔۔۔ چلو اپنے اپنے گھر"۔

سب نے اس فیصلے پر صاد کیا۔۔۔ جب وہ چلے گئے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص جو بے داغ کالی اچکن پہنتا تھا اور رؤساء کے کوٹ صاف کیا کرتا ہے، ہوش میں آیا۔۔۔ اس کی اچکن کیچڑ سے اٹی ہوئی تھی، مگر اسے صاف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

حجامت

"میری تو آپ نے زندگی حرام کر رکھی ہے۔۔۔ خدا کرے میں مر جاؤں"۔

"اپنے مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ہو۔ میں مر جاؤں تو سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔۔۔ کہو تو میں ابھی خود کشی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں پاس ہی افیم کا ٹھیکہ ہے۔ ایک تولہ افیم کافی ہو گی"۔

"جاؤ' سوچتے کیا ہو"۔

"جاتا ہوں۔۔۔ تم اٹھو اور مجھے۔۔۔ معلوم نہیں ایک تولہ افیم کتنے میں آتی ہے۔ تم مجھے اندازاً" دس روپے دے دو"۔

"دس روپے؟"

"ہاں بھئی۔۔۔ اپنی جان گنوانی ہے۔۔۔ دس روپے زیادہ تو نہیں"۔

"میں نہیں دے سکتی"۔

"ضرور آپ کو افیم کھا کے ہی مرنا ہے؟"

"سنکھیا بھی ہو سکتا ہے"۔

"کتنے میں آئے گا؟"

"معلوم نہیں--- میں نے آج تک کبھی سنکھیا نہیں کھایا"۔

"آپ کو ہر چیز کا علم ہے۔ بنتے کیوں ہیں؟"

"بنا تم مجھے رہی ہو--- بھلا مجھے زہروں کی قیمتوں کے متعلق کیا علم ہو سکتا ہے"۔

"آپ کو ہر چیز کا علم ہے"۔

"تمہارے متعلق تو میں ابھی تک کچھ بھی نہ جان سکا"۔

"اس لئے کہ آپ نے میرے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں"۔

"یہ صریحاً" تمہاری زیادتی ہے--- پانچ برس ہو گئے ہیں۔ تم ان میں سے کوئی ایسا دن پیش کرو جب میں نے تمہارے متعلق نہ سوچا ہو"۔

"ہٹائیے--- ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں' ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں"۔

"تم حقیقت کو خرافات کہتی ہو؟--- میں اب کیا کہوں"۔

"جو کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالئے--- آپ کی زبان میں لگام ہی کہاں ہے"۔

"پھر تم نے بدزبانی شروع کر دی"۔

"بدزبان تو آپ ہیں--- میں نے ان پانچ برسوں میں' آپ سر پر قرآن اٹھا کر کہئے' کب آپ سے اس قسم کی گستاخی کی ہے؟ گستاخ ہوں گے آپ کے---"

"رک کیوں گئی ہو--- جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو"۔

"میں کچھ کہنا نہیں چاہتی--- آپ سے کوئی کیا کہے--- آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف پہنچے' لیکن وہ اف بھی نہ کرے۔ میں تو ایسی زندگی سے گھبرا گئی ہوں"۔

"تم چاہتی کیا ہو' یہ بھی تو پتا چلے"۔

"میں کچھ نہیں چاہتی"۔

"پھر یہ گلے شکوے کیا معنی رکھتے ہیں؟"

"ان کے معنی آپ بخوبی سمجھتے ہیں--- انجان کیوں بنتے ہیں؟ ان گلے شکووں کے پیچھے کوئی بات تو ہو گی"۔

"کیا؟"

"میں کیا جانوں"۔

"یہ عجیب منطق ہے--- خود ہی پھاڑتی ہو خود ہی رفو کرتی ہو--- جو صحیح بات ہے اس کو بتاتی کیوں نہیں ہو--- میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ہر روز کے جھگڑے ہمیں کہاں لے جائیں گے"۔

"جہنم میں"۔

"وہاں بھی تو ہمارا ساتھ ہو گا"۔

"میں تو وہاں بالکل نہیں جاؤں گی"۔

"تو کہاں ہو گی تم؟"

"مجھے معلوم نہیں"۔

"تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں ہوتیں--- سب سے بڑی بات میری محبت ہے' جس کا احساس تمہیں ابھی تک نہیں ہوا--- میری سمجھ میں نہیں آتا--- یا میں نے اس کے اظہار میں بخل کیا ہے' یا تم میں وہ حس نہیں جو اس جذبے کو پہچان سکے"۔

"اصل میں بے حس تو آپ ہیں"۔

"کیسے؟"

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ ان پانچ برسوں میں ہر روز--- ہر روز---"

"یہی تو میری محبت کا ثبوت ہے"۔

"لعنت ہے ایسی محبت سے کہ آدمی تنگ آجائے"۔

"محبت سے کون تنگ آسکتا ہے؟"۔

"میری مثال موجود ہے"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟"

"میں نے کب اقرار کیا ہے"۔

"یہ اقرار ہی تو تھا"۔

"ہو گا"۔

"ہو گا نہیں--- تھا--- لیکن تم مانو گی نہیں۔ اس لئے کہ ضدی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی نفسیات کیا ہیں۔ جب ان سے

پیار کیا جائے تو گھبرا جاتی ہیں، اور جب ان سے ذرا بے اعتنائی برتی جائے تو برہم ہو جاتی ہیں"۔

"محض بکواس ہے"۔

"اس لئے کہ یہ پر خلوص خاوند کی زبان سے نکلی ہے"۔

"ہٹائیے--- آپ کا خلوص میں دیکھ چکی ہوں"۔

"جب دیکھ چکی ہو تو ایمان کیوں نہیں لاتی ہو؟"

"مجھے تنگ نہ کیجئے، میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی---"۔

"اپنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتی؟"

"خدا کی قسم---- آج نہیں"۔

"کل تو اچھا سمجھو گی"۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں"۔

"یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے--- مگر تمہیں معلوم نہیں ہوتا--- یہ کیا سلسلہ ہے؟--- تم صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو"۔

"تو سن لیجئے--- میں آپ سے نفرت کرتی ہوں"۔

"مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے--- میں نے تمہاری ہر آسائش کا خیال رکھا---"

"لیکن ایک بات کا خیال نہیں رکھا"۔

"کس بات کا؟"

"آپ عقل مند ہیں--- خود سمجھئے--- میں کیوں بتاؤں"۔

"کوئی اشارہ تو کر دو"۔

"میں ایسی اشارہ بازیاں نہیں جانتی"۔

"تم نے ایسی گفتگو کہاں سے سیکھی ہے؟"۔

"آپ سے"۔

"مجھ سے؟--- مجھے حیرت ہے کہ یہ الزام تم نے مجھ پر کیوں لگایا ہے"۔

"آپ پر تو ہر الزام لگ سکتا ہے"۔

"مثال کے طور پر؟"

"میں آپ کو مثال نہیں دے سکتی--- خدا کے لئے یہ گفتگو بند کیجئے، میں تنگ آگئی ہوں--- بس، میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے---"

"کیا؟"

"یا اللہ میری توبہ!--- مجھے زیادہ تنگ نہ کیجئے--- میرا جی چاہتا ہے اپنے سر کے بال نوچنا شروع کر دوں"۔

"میرا سر موجود ہے--- تم اس کے بال بڑے شوق سے نوچ سکتی ہو"۔

"آپ کو اتو اپنے بال بڑے عزیز ہیں"۔

"انسان کو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے"۔

''لیکن مردوں کے سر پر بالوں کے چھتے بھڑوں کو چھتے معلوم ہوتے ہیں--- آپ معلوم نہیں بال کٹوانے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں''۔

''میں پرہیزی آدمی ہوں''۔

''اس قدر جھوٹ--- ابھی پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ نے ایک پارٹی میں شراب پی تھی''۔

''لاحول ولا--- میں نے تو صرف شیری کا ایک گلاس پیا تھا''۔

''وہ کیا بلا ہوتی ہے؟''

''بڑی بے ضرر قسم کی چیز ہے''۔

''تمہاری بدزبانیاں کہیں مجھے بھی بدزبان نہ بنا دیں''۔

''جیسے آپ بدزبان نہیں ہیں''۔

''بدزبان تمہارا باپ تھا--- جانتی ہو--- وہ ہر بات میں مغلظات بکتا تھا''۔

''میں کہتی ہوں میرے موئے باپ کے متعلق کچھ نہ کہئے--- آپ بڑے واہیات ہوتے جا رہے ہیں''۔

''واہیات کیسے ہوتا جا رہا ہوں؟''

''میں نہیں جانتی''۔

''جاننے کے بغیر تم نے یہ فتویٰ کیسے عائد کر دیا''۔

''میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اتنے بال کیوں بڑھا رکھے ہیں' مجھے وحشت ہوتی ہے''۔

"بس اتنی سی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنا دیا--- میں جا رہا ہوں"۔

"کہاں؟"

"بس جا رہا ہوں"۔

"خدا کے لئے مجھے بتا دیجئے--- میں خودکشی کر لوں گی"۔

"میں نصرت ہیر کٹنگ سیلون میں جا رہا ہوں"۔

مرزا غالب کی حشمت خاں کے گھر دعوت

جب حشمت خاں کو معلوم ہو گیا کہ چودھویں (ڈومنی) اس کے بجائے مرزا غالب کی محبت کا دم بھرتی ہے۔ حالانکہ وہ اس کی ماں کو ہر مہینے کافی روپے دیتا ہے اور قریب قریب طے ہو چکا ہے کہ اس کی مسی کی رسم بہت جلد بڑے اہتمام سے ادا کر دی جائے گی' تو اس کو بڑا تاؤ آیا۔ اس نے سوچا کہ مرزا نوشہ کو کسی نہ کسی طرح ذلیل کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک دن مرزا کو رات کو اپنے یہاں مدعو کیا۔

مرزا غالب وقت کے بڑے پابند تھے۔ جب حشمت خاں کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ گنتی کے چند آدمی چھولداری کے نیچے شمعوں کی روشنی میں بیٹھے ہیں--- گاؤ تکیے لگے ہیں۔ اگالدان جابجا قالینوں پر موجود پڑے ہیں۔

غالب آئے' تعظیماً" سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان سے معانقہ کیا اور حشمت خاں سے مخاطب ہوئے "ہائیں--- خاں صاحب یہاں تو سناٹا پڑا ہے--- ابھی کوئی نہیں آیا؟"

حشمت خاں مسکرایا "یوں کیوں نہیں کہتے کہ اندھیرا پڑا ہے---

چودھویں آئے تو ابھی چاندنی چھٹک جائے"۔

مرزا غالب نے یہ چوٹ بڑے تحمل سے برداشت کی۔ "سچ تو یوں ہے کہ آپ کے گھر میں چودہویں کے دم سے روشنی ہے--- ہتکڑیوں کی جھنکار اور آپ کی تیز رفتار کے سوا دھرا ہی کیا ہے؟"

حشمت خاں کھسیانا سا ہو گیا--- اس کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اتنے میں دو تین اصحاب اندر داخل ہوئے جن کو حشمت خاں نے مدعو کیا تھا۔ آگے آیئے جنابِ جمیل احمد خاں صاحب--- آیئے اور بھئی سرور خاں' تم نے بھی حد کر دی"۔

حشمت خاں کے ان مہمانوں نے جو اس کے دوست تھے' موزوں و مناسب الفاظ میں معذرت چاہی اور چاندنی پر بیٹھ گئے۔

حشمت خاں نے اپنے ملازم کو اپنی گرج دار آواز میں بلایا "منے خاں!"

"بی چودہویں ابھی تک نہیں آئیں--- "کیا وجہ؟"

منے خاں نے عرض کی "جی حضور' بہت دیر سے آئی لال کمرے میں میں ہیں--- سارے سماجی حاضر ہیں--- کیا حکم ہے؟"

حشمت خاں طشتری میں سے پان کا چاندی اور سونے کے ورق لگا ہوا بیڑا اٹھایا اور اپنے نوکر کو دیا "لو یہ بیڑا دے دو--- محفل میں آجائیں گانا اور ناچ شروع ہو"۔

منے خان لال کمرے میں گیا۔ جودہویں' چوڑی دار پائجامہ پہنے

دونوں ٹخنوں پر گھنگھرو باندھے تیار بیٹھی تھی۔ اس نے اس سانولی سلونی جوانی کو بیڑا دیا۔ چودھویں نے اسے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھی' دونوں پاؤں فرش پر مار کر گھنگھروؤں کی نشست دیکھی اور سماجیوں سے کہا ''تم لوگ چلو اور لہرا بجانا شروع کرو--- میں آئی''۔

سماجیوں نے حاضرین کو فرشی سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ طبلہ سارنگی سے ملنے لگا' لہرا بجنا شروع ہوا ہی تھا کہ چودھویں' لال کمرے ہی سے ناچتی تھرکتی محفل میں آئی' کورنش بجا لا کر ایک چھناکے کے ساتھ ناچنے لگی۔

جمیل احمد نے ایک توڑے پر بے اختیار ہو کر کہا ''بی چودھویں' کیا کیا ناچ کے انگوں میں بھاؤ لجاؤ بتا رہی ہو''۔ چودھویں نے جو کہ ایک نیا توڑا لے رہی تھی' اسے ختم کر کے تسلیم بجا لاتے ہوئے کہا ''حضور' آپ رئیس لوگ قدردانی فرماتے ہیں ورنہ میں ناچنا کیا جانوں''۔

سرور خاں بہت مسرور تھے' کہا ''سچ تو یہ ہے' بی چودھویں تم ناچتی ہو تو معلوم ہوتا ہے پھل جھڑی پھوٹ رہی ہے''۔

جلیل احمد مسرور خاں سے مخاطب ہوئے ''اماں گل ریز نہیں کہتے''۔ پھر انہوں نے غالب کی طرف دیکھا ''کیوں مرزا نوشہ--- صحیح عرض کر رہا ہوں نا؟''

غالب نے تھوڑے توقف کے بعد چودھویں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا ''میں تو نہ پھل جھڑی کہوں گا اور نہ گل ریز--- بلکہ یوں کہوں گا کہ

معلوم ہوتا ہے مہتاب پھوٹ رہی ہے"۔

جمیل احمد بولے "واہ واہ۔ کیوں نہ ہو۔ شاعر ہیں ناشاعر' چودھویں کا ناچ اور مہتاب' نہ پھل جھڑی نہ گل ریز--- سبحان اللہ' سبحان اللہ!"

حشمت خاں نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا "ایک تو یوں ان بی صاحبہ کا دماغ چوتھے آسمان پر ہے' آپ لوگ اور ساتویں آسمان پر پہنچا رہے ہیں"۔

چودھویں ناچتے ایک ادا سے حشمت خاں کو کہتی ہے' "جی ہاں آپ کو تو بس کیڑے ڈالنے آتے ہیں"۔

حشمت خاں مسکراتا ہے اور اپنے دوستوں کی طرف دیکھتا ہے۔ "اچھا حضرات سنئے۔ چودھویں جس وقت ناچتی ہے' معلوم دیتا ہے پانی پر مچھلی تیر رہی ہے"۔ پھر چودھویں سے مخاطب ہوتا ہے "لے اب خوش ہوئیں"۔

چودھویں ناچنا بند کر دیتی ہے اور ننھی سی ناک چڑھا کر کہتی ہے' "دماغ کہاں پہنچا ہے۔ سڑی بدبودار مچھلی--- دور پا--- نوج میں کیا مچھلی ہوں"۔

محفل میں فرمائشی قہقہے لگتے ہیں۔ حشمت خاں کو چودھویں کا جواب ناگوار معلوم ہوتا ہے--- مگر چودھویں اس کے بگڑی ہوئے تیوروں کی کوئی پرواہ نہیں کرتی اور غالب کو محبت کی نظر سے دیکھ کر ان کی یہ غزل بڑے جذبے کے ساتھ گانا شروع کرتی ہے۔

یہ جو ہم ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں

کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں!
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

چودہویں یہ غزل غالب کی طرف رخ کر کے گاتی ہے اور کبھی کبھی مسکرا دیتی ہے--- غالب بھی متبسم ہو جاتے ہیں۔ حشمت خاں جل بھن جاتا ہے اور چودہویں سے بڑے کڑے لہجے میں کہتا ہے "ادے ہٹاؤ' یہ غزلیں وزلیں' کوئی ٹھمری داد راگاؤ"۔

چودہویں غزل گانا بند کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کی طرف تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہے اور یہ ٹھمری الاپنا شروع کرتی ہے۔

پیا بن ناہیں چین

حشمت خاں کے سارے منصوبے خاک میں ملے جا رہے تھے۔ اپنی کرخت آواز میں جان محمد کو بلاتا ہے اور اس سے کہتا ہے "وہ میرا صندوقچہ لانا"۔

جان محمد بڑے ادب سے دریافت کرتا ہے "کون سا صندوقچہ حضور؟"

"ارے وہی' جس میں کل میں نے تمہارے سامنے کچھ زیورات لا کے رکھے ہیں"۔

گانا جاری رہتا ہے--- اس دوران میں جان محمد صندوقچہ لا کر حشمت خاں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ غالب کو جو چودہویں کا گانا سننے میں محو ہے ایک نظر دیکھ کر مسکراتا ہے۔ صندوقچہ کھول کر ایک جڑاؤ گلوبند نکال کر

چودہویں سے مخاطب ہوتا ہے ''چودہویں --- ادھر دیکھو --- یہ گلوبند کس کا؟''

چودہویں ایک ادا کے ساتھ جواب دیتی ہے ''میرا''۔

حشمت خاں' غالب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہے اور صندوقچے سے جڑاؤ جھالے نکال کر چودہویں سے پوچھتا ہے' ''اچھا یہ جھالے کس کے!''

پھر وہی ادا' پر اب جو تصنع اختیار کر رہی تھی ''میرے!''

حاضرین یہ تماشا دیکھ رہے تھے' جن میں مرزا غالب بھی شامل تھے۔ سب حیران تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

حشمت خاں اب کی کڑے نکالتا ہے ''چودہویں یہ کڑوں کی جوڑی کس کی؟''۔

چودہویں کی ادا بالکل بناوٹ ہو گئی ''میری!''۔

اب حشمت خاں بڑی خود اعتمادی سے اس سے سوال کرتا ہے ''اچھا اب یہ بتاؤ۔ چودہویں کس کی؟''

چودہویں توقف کے بعد ذرا آنچل کی آڑ لے کر دیکھتی ہے ''آپ کی''۔

غالب خاموش رہتے ہیں۔ لیکن حشمت خاں جو شائد چودہویں کے آنچل کی اوٹ کا جواب سمجھ نہیں سکا تھا' مرزا سے کہا ''آپ بھی گواہ رہیے گا''۔

غالب نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا "سازشی مقدمے میں گواہی مجھ سے دلواتے ہو"۔

"تم نے نہیں سنا؟"

مرزا غالب محفل سے اٹھ کر جاتے ہوئے حشمت خاں سے کہتے ہیں' "کچھ دیکھا نہ کچھ سنا--- اور دوسرے مجھی سے مقدمہ اور مجھی سے گواہی--- غضب' اندھیرا!"

غالب کے جانے کے بعد محفل درہم برہم ہو جاتی ہے--- چودھویں سے حشمت خاں گانا جاری رکھنے کے لئے کہتا ہے--- صرف حکم کی تعمیل کے لئے وہ گاتی ہے' مگر اکھڑے ہوئے سروں میں۔

حشمت خاں دلی طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ شکست خوردہ ہے--- آج کا میدان غالب مار گئے۔

دوسرے روز صبح غالب کا بھیجا ہوا آدمی مداری چودھویں کے گھر پہنچتا ہے اور چودھویں سے ملتا ہے--- وہ اس کو پہچانتی تھی' اس لئے بہت خوش ہوتی ہے اور اس سے پوچھتی ہے "کیوں میاں مردھے' کہاں سے آئے ہو؟"

"جی حبش خاں کے پھاٹک سے آیا ہوں--- نواب مرزا اسداللہ خان صاحب نے بھیجا ہے"۔

چودھویں کا دل دھڑکنے لگا "کیوں کیا بات ہے؟"

"جی نہیں' انہوں نے یہ توڑا بھیجا ہے" یہ کہہ کر مداری ایک توڑا

چودہویں کو دیتا ہے۔ جسے وہ جلدی جلدی بڑے اشتیاق سے کھولتی ہے۔ اس میں سے زیورات نکلتے ہیں۔

مداری اس سے کہتا ہے "بی بی جی گن کے سنبھال لیجئے اور ایک بات جو نواب صاحب نے کہی ہے' وہ سن لیجئے"۔

"کیا کہا؟"

مداری تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد زبان کھولتا ہے۔۔۔ "انہوں نے کہا تھا۔۔۔ اپنے رئیس جمعدار حشمت خاں سے کہنا کہ جن مقدموں کا فیصلہ روپیہ پیسہ چڑھا کر بڑی آسانی سے اپنے حق میں ہو جائے' ان پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی"۔

چودہویں گذشتہ رات کے واقعات کی روشنی میں مرزا نوشہ کی اس بات کو فوراً" سمجھ جاتی ہے اور دانتوں سے اپنی مخروطی انگلیوں کے ناخن کاٹنا شروع کر دیتی ہے اور سخت پریشان ہو کر کہتی ہے "وہی ہوا جو میں سمجھتی تھی۔۔۔ میاں مردھے' تم ذرا ٹھہرو' تو میں تم سے کچھ کہوں"۔

مداری چند لمحات سوچتا ہے "لیکن بی بی جی نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ دیکھو مداری' یہ توڑا دے آنا۔۔۔ واپس نہ لانا اور فوراً" چلے آنا"۔

چودہویں اور زیادہ مضطرب ہو جاتی ہے "ذرا دم بھر ٹھہرو۔۔۔ سنو' ان سے کہنا۔۔۔ میں کیوں کر۔۔۔ ہاں یہ کہنا کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔۔۔ لیکن سنا تم نے۔۔۔ کہنا میں مجبوری سے کہہ گئی۔۔۔ نہیں نہیں مردھے بابا' کہنا' ہاں کیا؟۔۔۔ بس یہی کہ میرا قصور کچھ نہیں"۔ یہ کہتے

کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ "لیکن سنامیاں مداری--- تم اتنا ضرور کہنا کہ آپ خود تشریف لائیں' تو میں اپنے دل کا حال کہوں--- اچھا تو یوں کہنا--- زبانی عرض کروں گی--- ہائے اور کیا کہوں--- سنو میرا ہاتھ جوڑ کر سلام کہنا"۔

مداری اچھا اچھا کہتا چلا جاتا ہے۔ لیکن چودہویں اسے آنسو بھری آنکھوں سے سیڑھیوں کے پاس ہی روک لیتی ہے۔ "اے میاں مردھے--- اے میاں مداری--- کہنا میری جان کی قسم ضرور آیئے گا--- کہنا میرا مردہ دیکھئے--- چودہویں بدنصیب کو اپنے ہاتھ سے گاڑیئے جو نہ آیئے--- دیکھو ضرور سب کچھ کہنا"۔

مداری چلا جاتا ہے۔ وہ روتی روتی بیٹھک میں آتی ہے اور گاؤ تکئے پر گر کر آنسو بہانے لگتی ہے--- تھوڑی دیر کے بعد جمعدار حشمت خاں آتا ہے اور معنی خیز نظروں سے اس کو دیکھتا ہے--- چودہویں کو اس کی آمد کا کچھ احساس نہیں ہوتا' اس لئے وہ غم و اندوہ کے ایک اتھاہ سمندر میں تھپیڑے کھا رہی تھی۔ حشمت خاں اس کے پاس ہی مسند پر بیٹھ جاتا ہے--- پھر بھی چودہویں کو اس کی موجودگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا--- بے خودی کے عالم میں وہ اس کی طرف بالکل خالی نظروں سے دیکھتی ہے اور بڑبڑاتی ہے "جانے وہ ان سے سب باتیں کہے گا بھی یا نہیں"۔

حشمت خاں جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا' کرخت آواز میں بولا "میری جان مجھ سے کہی ہوتیں تو ایک ایک تمہارے مرزا نوشہ تک پہنچا دیتا"۔

چودھویں چونک پڑتی ہے' جیسے اس کو خوابوں کی دنیا میں کسی نے ایک دم جھنجھوڑ کر جگا دیا--- اس کی آنسو بھری آنکھیں دھندلی ہو رہی تھیں--- اسے صرف سیاہ نوکیلی مونچھیں دکھائی دیں' جن کا ایک ایک بال اس کے دل میں تکلوں کی طرح چبھتا گیا--- آخر اسے کوئی ہوش نہ رہا--- وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی ایک چلتر ہے جو عام طور پر طوائفوں اور ڈومنیوں سے منسوب ہے--- وہ زور زور سے قہقہے لگاتا رہا اور ڈومنی بے ہوشی کے عالم میں مرزا نوشہ کی خاطر مدارات میں فوراً" مشغول ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس کے بلانے پر آگئے تھے۔

لعنت ہے ایسی دوا پر

"آپکو آج اتنی کھانسی کیوں آرہی ہے؟"

"موسم کی تبدیلی کی وجہ سے گلا خراب ہو گیا ہے"۔

"یہ سب بہانے ہیں--- مجھے معلوم ہے اس کھانسی کی اصل وجہ کیا ہے"۔

"تو بتادو"۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے' جب کہ آپ اس کا علاج خود کر سکتے ہیں مجھ سے آپ نے کبھی اپنی ذاتی معاملوں کے متعلق مشورہ لیا ہے؟"

"کب نہیں لیا--- ابھی کل ہی میں نے تم سے پوچھ کر' بلکہ تمہیں دکان پر لے جا کر اپنے لئے "لوفرشو" خریدا تھا--- اور تم نے اپنی مرضی کے مطابق ایک سینڈل لی تھی۔ حالانکہ وہ مجھے سخت ناپسند تھی"۔

"آپ کو تو میری پسند کی ہر چیز ناپسند ہوتی ہے"۔

"تم غلط کہتی ہو--- پچھلے دنوں تم نمائش سے اپنے لئے بلاؤز کا کپڑا لائی تھیں تو میں نے بہت پسند کیا تھا--- اور تمہارے ذوق اور انتخاب کی

تعریف کی تھی"۔

"زندگی میں ایک دفعہ تعریف کر دی تو بڑا احسان کیا"۔

"اس میں احسان کی کیا بات ہے---- معلوم نہیں آج تمہارا مزاج کیوں بگڑ گیا ہے"۔

"مجھے کھانسی کی شکایت ہے۔ ساری رات کھانستی رہی ہوں"۔

"میں رات بھر جاگتا رہا ہوں---- صرف میں نے تمہارے خراٹوں کی آواز کے میں نے تمہارے حلق سے اور کسی قسم کی آواز نہیں سنی"۔

"آپ ایک عرصہ سے بہرے ہو چکے ہوں---- آپ کے کانوں کے پاس کوئی لاکھ چلائے' واویلا کرے' مگر آپ کو کبھی سنائی نہیں دے گا"۔

"یہ کیا گفتگو ہے؟---- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو"۔

"میں کچھ کہنا نہیں چاہتی---- اور کہنا بھی چاہوں' تو آپ کان دھر کر سنیں گے کب"۔

"کیوں نہیں سنوں گا---- مگر تم کچھ کہو تو---- اب میں تمہارے دل کی بات کیسے بوجھوں"۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے---- مگر یہاں یہ راہ سرے ہی سے غائب ہے"۔

"کیسی غائب ہو گئی یہ راہ' میرا مطلب ہے' کوئی تمہارا میرا کوئی رشتہ نہیں رہا"۔

"بس سمجھ لیجئے' کچھ ایسی ہی بات ہے"۔

"یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے' کہ مجھے جس بات کا وہم و گمان بھی نہیں' تم آج اس کا مجھ پر انکشاف کر رہی ہو—— داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ عورت کو سمجھانا کارے دارد والا معاملہ ہے"۔

"جی—— وہ دانا بھی تو ایسے مرد تھے—— بھولی بھالی عورت میں ایسا کون سا پیچ ہے' جو ان کی دانائی کو شکست دے گیا—— وہ غریب تو ایک سیدھی سڑک ہے جس میں کوئی خم ہے نہ موڑ"۔

"درست ہے—— لیکن اس سیدھی سڑک پر ہر روز کئی "ایکسیڈنٹ" ہوتے ہیں—— ہزاروں مرد اس سیدھی سڑک پر چلتے چلتے ایسے پھسلتے ہیں کہ سیدھے قبرستان میں پہنچ جاتے ہیں"۔

"آپ کیوں نہیں پہنچے ابھی تک وہاں؟"

"عنقریب پہنچ جاؤں گا—— اگر تمہارا رویہ اسی قسم کا رہا"۔

"میرا رویہ"—— کیوں؟—— میں نے آپ سے کیا بدسلوکی کی ہے؟—— نوکرانی کی طرح آپ کی خدمت کرتی رہی ہوں' کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟"۔

"انکار کرنے کی مجال ہی نہیں' اس لئے کہ یہ ڈر ہے کہ تم آتش فشاں پہاڑ کی مانند پھٹ پڑو گی۔ اور اتنا لاوا اگلو گی کہ مجھے ایک لمحے کے اندر کوئلہ بنا کر رکھ دے گا"۔

"آتش فشاں پہاڑ تو آپ ہیں' جو آئے دن لاوا اگلتے رہتے ہیں"۔

"یہ تمہارے اخبار کی نئی خبر ہے' جو میں تمہاری زبان سے سن رہا ہوں۔ ورنہ اس سے پہلے۔۔۔"

"آپ اپنے اخبار میں یہی مضمون چھاپتے رہتے تھے کہ عورتیں آگ کھاتی ہیں۔ انگارے بگتی ہیں۔۔۔ اور یہ جو مردوں کو کھانسی آتی ہے اس کی وجہ بھی عورت ہے"۔

"لو' تم نے کھانسی کا نام لیا تو میرے گلے میں خارش شروع ہو گئی۔۔۔ اچھا' اب بات مت کرو۔۔۔ دوا کا ایک ڈوز پینے کے بعد کسی قدر طبیعت بحال ہو گئی ہے"۔

"خدا آپ کی طبیعت کو بحال رکھے۔۔۔ میری تو یہی دعا ہے"۔

"تمہاری دعاؤں ہی سے تو میں اب تک زندہ ہوں' ورنہ' کب کا مر چکا ہوتا"۔

"آپ کی یہ طنزیہ گفتگو مجھے پسند نہیں۔۔۔ مہین مہین چٹکیاں لینے میں جانے آپ کو کیا مزہ آتا ہے؟"۔

"سارا مزہ تم لے جاتی ہو۔۔۔ مہین مہین چٹکیوں کا فن تم بہتر جانتی ہو۔۔۔ میں اس سے بالکل کورا ہوں"۔

"آپ تو ہر چیز سے کورے ہیں۔ کورے برتن کی طرح۔۔۔ لیکن دنیا بھر کی آلائشیں اس برتن کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں"۔

"آج تم فلسفہ چھانٹنے لگی ہو"۔

"یہ اگر فلسفہ ہے' تو آپ خدا معلوم کیا چھانٹتے ہیں؟"

"۔۔۔مجھے پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہے"۔

"آپ دوا کیوں نہیں پیتے؟؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔۔۔ اس میں بہت بری بو ہے"۔

"تو کیا ہوا۔۔۔ دوا آخر دوا ہوتی ہے۔۔۔ خوش ذائقہ ہو یا بدذائقہ۔۔۔ اچھی بو والی ہے یا بری بو والی۔۔۔ انسان کو پینی ہی پڑتی ہے۔۔۔"

"تم۔۔۔ تم اپنا لیکچر بند کرو۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ یا اللہ میری توبہ۔۔۔ یہ کھانسی بھی کیا بلا ہے۔ سارا وجود متزلزل ہو جاتا ہے"۔

"آپ نے بدپرہیزی کی ہو گی"۔

"کون سی بدپرہیزی؟"۔

"چاٹ کھانے کی آپ کو چاٹ ہے۔۔۔ باہر ہی باہر کھاتے رہے ہوں گے"۔

"باہر باہر میں نے اس قسم کی کوئی چیز نہیں کھائی"۔

"لیکن، گھر پر تو آپ ہر روز کھاتے رہے ہیں"۔

"یہ الزام تم مجھ پر کس شہادت کی بنا پر عائد کر رہی ہو؟"

"جناب جب پچھلے ہفتے سرگودھا گئی تھی، تو واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے "آلو جھولے" تیار کر کے کھاتے رہے ہیں۔ املی، اچور، انار دانہ، سرخ اور کالی مرچیں، اس قدر ڈالی جاتی تھیں کہ آدمی

کی زبان جل جائے"۔

"لیکن تمہاری زبان نہیں جلی' یہ جھوٹ بولتے ہوئے--- تم اچھی طرح جانتی ہو---"

"میں آپ کے بارے میں ہر بات کے متعلق اچھی طرح جانتی ہوں--- کھٹی چیزوں سے آپ کو خاص رغبت ہے--- عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ عورتیں کھٹا کھانا بہت پسند کرتی ہیں--- لیکن آپ ان سے کئی رطیاں آگے بڑھے ہوئے ہیں"۔

"--- کھانسی کا دورہ پھر شروع ہو گیا---"

"ہونا ہی تھا--- دوا لاؤں؟"

"--- نہیں--- نہیں---"

"نہیں آپ کو پینا پڑے گی---"

"بھئی' میں کہہ چکا ہوں کہ اس کی بو بہت بری ہے۔ اس کے--- اس کے علاوہ ڈاکٹر کی--- ڈاکٹر کی یہ ہدایت ہے کہ ایک ایک گھنٹے کے بعد خوراک پی جائے"۔

"تو آپ کو اس ہدایت پر عمل کرنا چاہئے"۔

"خاک عمل کروں--- جب کہ دوا مجھے پسند ہی نہیں--- میں ہر گھنٹے کے بعد عذاب سہنے کے لئے تیار نہیں"۔

"آپ جو کچھ بھی کہیں ٹھیک ہے' لیکن یہ دوا آپ کو ضرور پینا پڑے گی"۔

"اچھا بابا--- میں ہارا' تم جیتیں--- لاؤں گلاس"۔

"میں نے تیار کر رکھا ہے--- یہ لیجئے"۔

"برف ڈال دی تھی اس میں؟"

"جی ہاں۔ آپ تو پہلے پانی ملا کر پیتے رہے ہیں--- لیکن سرگودھا جانے سے پہلے' آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ ہدایت کی تھی کہ یہ دوا کھارے سوڈے کے ساتھ پی جائے--- چنانچہ میں نے---"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ لاؤ' گلاس دو مجھے کہ زہر مار کر لوں"۔

"یہ لیجئے--- مگر آپ کا ہاتھ کانپ رہا ہے"۔

"کانپنے دو--- دوا پینے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا"۔

"کھانسی بھی انشاء اللہ دور ہو جائے گی"۔

"دیکھو جو اللہ کو منظور ہے--- تو یہ' کیسی بری بو ہے اس کی--- خوراک بھی اتنی بڑی ہے جو گھوڑوں کو دی جاتی ہو گی--- بڑی بوتل میں بارہ کے نشان ہیں--- یعنی دن میں بارہ مرتبہ اس واہیات چیز کو پانی یا سوڈے کے ساتھ ملا کر پیا جائے--- یہ ڈاکٹر لوگ بھی عجیب قسم کے انسان ہیں--- مریض کی نفسیات کے متعلق کچھ سوچتے ہی نہیں"۔

"نفسیات--- یہ کیا چیز ہے"۔

"ٹھہرو--- میں یہ دوا پی لوں' تو بتا دوں گا کہ یہ کیا چیز ہے"۔

"--- آپ کہتے تھے کہ یہ دوا بہت بری ہے' لیکن آپ سارا گلاس

یوں پی گئے' جیسے کوئی بڑا مزے دار شربت ہو"۔

"تو کیا کرتا۔۔۔ مجبوری میں' انسان کو ہر مشکل خندہ پیشانی سے برداشت کرنا پڑتی ہے"۔

"اب گیارہ بجے ہیں۔۔۔ بارہ بجے آپ کو پھر یہی دوائی پینا ہے"۔

"پیوں گا۔۔۔ میرا باپ بھی پئے گا۔۔۔ خدا اسے جنت نصیب کرے"۔

"اچھا' اب مجھے آرام کرنے دو۔۔۔ بارہ بجے اس واہیات دوا کی خوراک لے آنا' جسے میں زہر مار کر لوں گا"۔

"کیا آپ سونا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' جب تک اس دوا کی بوتل ختم نہ ہو جائے"۔

"تو آپ لیٹے رہیں گے؟"

"نہیں۔۔۔ دوسرے کمرے میں جا کر کوئی کتاب یا رسالہ پڑھوں گا' جب تک بارہ بج جائیں گے"۔

"آپ کیا کھائیں گے؟"

جو تم نے پکایا ہو گا۔۔۔ ویسے اگر گردے ہوں تو بہت اچھے رہیں گے۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ بھنے ہوئے گردے تمہارے گردوں کو جو کسی قدر کمزور ہیں' تقویت بخشیں گے"۔

"میں ابھی منگوا کر تیار کئے دیتی ہوں"۔

"آخری ڈوز کہاں گئی؟"

"وہ میں نے اپنی ہمسائی کو دے دی۔۔۔ اس کو بھی کھانسی کی شکایت تھی"۔

"لیکن۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔ اسے کچھ فائدہ ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ اس پر اس کا الٹا اثر ہوا ہے۔۔۔ دوا کی خوراک پینے کے بعد واہی تباہی بکنے لگی۔۔۔ غالب اور میر کے شعر اپنے خاوند کو سناتی رہی"۔

"میں اتنے دنوں سے یہ دوائی پی رہا ہوں۔ غالب کا سارا کلام مجھے حفظ ہے، لیکن میں نے آج تک تمہیں اس کا کوئی بھی شعر نہیں سنایا"۔

"شعر تو نہیں سنایا ہے۔۔۔ لیکن رات کو آپ اکثر سیاسیات پر لیکچر دیا کرتے ہیں"۔

"لیکچر۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرا خیال ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس دوا میں شراب کا جز ہے"۔

"شراب کا جز قطعاً" نہیں۔۔۔ اس کا ہر قطرہ شراب ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"جی، ساری چالاکی کا علم ہو گیا۔۔۔ میری ہمسائی کے خاوند نے جب ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے کہا کہ آپ کی عورت نے شراب پی ہے"۔

"تو لعنت ہے ایسی دوا پر"۔

حج اکبر

امتیاز اور صغیر کی شادی ہوئی تو شہر بھر میں دھوم مچ گئی۔ آتش بازیوں کا رواج باقی نہیں رہا تھا مگر دولہے کے باپ نے اس پرانی عیاشی پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

"جب صغیر زیوروں سے لدے پھندے سفید براق گھوڑے پر سوار تھا' تو اس کے چاروں طرف انار چھوٹ رہے تھے۔ مہتابیاں اپنے رنگ برنگ شعلے بکھیر رہی تھیں۔ پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ صغیر خوش تھا۔ بہت خوش کہ اس کی شادی امتیاز سے طے پا گئی تھی جس سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔

صغیر نے امتیاز کو ایک شادی کی تقریب میں دیکھا۔ اس کی صرف ایک جھلک اسے دکھائی دی تھی۔ مگر وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور اس نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کسی کو اپنی رفیقہ حیات نہیں بنائے گا' چاہے دنیا ادھر کی ادھر نہ ہو جائے۔

دنیا ادھر کی ادھر نہ ہوئی۔ صغیر نے امتیاز سے ملنے کے راستے ڈھونڈ

لئے۔ شروع شروع میں اس خوبرو لڑکی کے حجاب آڑے آیا' لیکن بعد میں صغیر کو اس کا التفات حاصل ہو گیا۔

صغیر بہت مخلص دل نوجوان تھا۔ اس میں ریاکاری نام کو بھی نہ تھی۔ اس کو امتیاز سے محبت ہو گئی تو اس نے یہ سمجھا کہ اسے اپنی زندگی کا اصل مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ امتیاز اسے قبول کرے گی یا نہیں۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اپنی محبت کے جذبے ہی کے سہارے ساری زندگی بسر کر دیتا۔

اس کو جب امتیاز سے پہلی مرتبہ بات کرنے کا موقعہ ملا تو اس نے گفتگو کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی' "دیکھو لالی' میں ایک نامحرم آدمی ہوں۔ میں نے مجبور کیا ہے کہ تم مجھ سے ملو۔ اب اس ملاپ کا انجام نیک ہونا چاہئے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے علاوہ اور کوئی عورت زندگی میں نہیں آئے گی۔ یہ میرے ضمیر اور دل کی اکٹھی آواز ہے۔۔۔ تم بھی وعدہ کرو کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھے کوئی آزار نہیں پہنچاؤ گی اور میری موت کے بعد بھی مجھے یاد کرتی رہو گی۔ اس لئے کہ قبر میں بھی میری سوکھی ہڈیاں تمہارے پیار کی بھوکی ہوں گی"۔

امتیاز نے دھڑکتے ہوئے دل سے وعدہ کیا کہ وہ اس عہد پر قائم رہے گی۔ اس کے بعد ان دونوں میں چھپ چھپ کے ملاقاتیں رہیں۔ صغیر اس کو نکاح سے پہلے ہاتھ لگانا بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں ان کا

موضوع عشق و محبت نہیں ہوتا تھا۔ صغیر مطمئن تھا کہ امتیاز اس کی محبت کی دعوت قبول کر چکی ہے۔ اس پر اب اور زیادہ گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے وہ اپنی محبوبہ سے ملنا اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ اس کے عادات و خصائل سے واقف ہو جائے اور وہ بھی اس کو اچھی طرح جان پہچان لے تاکہ وہ اس کی جبلت کا اندازہ کر سکے' اور اس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔

اس نے ایک دن امتیاز سے بڑے غیر عاشقانہ انداز میں کہا "تازی میں اب بھی تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھ میں کوئی خامی دیکھی ہے' اگر میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اترا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو' تم کسی بندھن میں گرفتار نہیں ہو--- تم مجھے دھتکار دو تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ میری محبت میرے لئے کافی ہے۔ میں اس کے اور ان ملاقاتوں کے سہارے کافی دیر تک جی سکتا ہوں"۔

امتیاز اس سے بہت متاثر ہوئی اس کا جی چاہا کہ صغیر کو اپنے گلے سے لگا کر رونا شروع کر دے' مگر وہ اسے ناپسند کرتا۔ اس لئے اس نے اپنے جذبات اندر ہی اندر مسل ڈالے۔

وہ چاہتی تھی کہ صغیر اس سے فلسفیانہ باتیں نہ کرے۔ لیکن کبھی کبھی اس طور پر بھی اس سے پیش آئے' جس طرح فلموں میں ہیرو' اپنی ہیروئن سے پیش آتا ہے۔ مگر صغیر کو ایسی عامیانہ حرکات سے نفرت تھی۔

بہرحال ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

پہلی رات کو حجلۂ عروسی میں جب صغیر داخل ہوا تو امتیاز چھینک رہی تھی۔ وہ بہت متفکر ہوا۔ امتیاز کو بلاشبہ زکام ہو رہا تھا' لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا خاوند اس معمولی سے عارضے کی طرف اتنا متوجہ ہو کہ اس کی تمام امنگوں کو فراموش کر دے۔ وہ سر تا پا سپردگی تھی۔ مگر صغیر کو اس بات کی تشویش تھی کہ امتیاز اس کی جان سے زیادہ عزیز ہستی علیل ہے' چنانچہ اس نے فوراً" ڈاکٹر بلوایا۔ جو دوائیاں اس نے تجویز کیں بازار سے خرید کر لایا اور اپنی نئی نویلی دلہن کو جس کو ڈاکٹر کی آمد سے کوئی دلچسپی تھی نہ اپنے خاوند کی تیمارداری سے' اسے مجبور کیا کہ وہ انجکشن لگوائے اور چار چار گھنٹے کے بعد دوا پیئے۔

زکام کچھ شدید قسم کا تھا' اس لئے چار دن اور چار راتیں صغیر اپنی دلہن کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ امتیاز چڑ گئی۔ وہ جانے کیا سوچ کر عروسی جوڑا پہنے صغیر کے گھر آئی تھی۔ مگر وہ بے کار اس کے زکام کو درست کرنے کے پیچھے پڑا ہوا تھا' جیسے دولہا دلہن کے لئے بس ایک یہی چیز اہم ہے' باقی اور باتیں فضول ہیں۔

تنگ آکر ایک دن اس نے اپنے ضرورت سے زیادہ شریف شوہر سے کہا "آپ چھوڑیئے میرے علاج معالجے کو۔۔۔ میں اچھی بھلی ہوں"۔ پھر اس نے دعوت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں دلہن ہوں۔ آپ کے گھر آئی ہوں' اور آپ نے اسے ہسپتال بنا دیا ہے"۔

صغیر نے بڑے پیار سے اپنی دلہن کا ہاتھ دبایا اور مسکرا کر کہا "تازی'

خدا نہ کرے کہ یہ ہسپتال ہو۔ یہ میرا گھر نہیں تمہارا گھر ہے"۔

اس کے بعد امتیاز کو جو فوری شکایت تھی رفع ہو گئی۔ اور وہ شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔ صغیر اس سے محبت کرتا تھا' لیکن اس کو ہمیشہ امتیاز کی صحت' اس کے جسم کی خوبصورتیوں اور اس کو تر و تازہ دیکھنے کا خیال رہتا۔ وہ اسے کانچ کے نازک پھولدان کی طرح سمجھتا تھا جس کے متعلق ہر وقت یہ خدشہ ہو کہ ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جائے گا۔

امتیاز اور صغیر کا رشتہ دوہرا تھا۔ دو بھائی اصغر حسین اور امجد حسین تھے۔ کھاتے پیتے تاجر۔ صغیر بڑے بھائی اصغر حسین کا لڑکا تھا' اور امتیاز امجد حسین کی بیٹی۔ اب یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ شادی سے پہلے دونوں بھائیوں میں کچھ اختلاف تھے جو اس کے بعد دور ہو گئے تھے۔

امتیاز کی دو بہنیں اور تھیں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ امتیاز کا بیاہ ہوا تو ان دونوں کی باری قدرتی طور پر آ گئی۔ وہ اپنے گھروں میں آباد بہت خوش تھیں۔ کبھی کبھی امتیاز سے ملنے آتیں اور صغیر کے اخلاق سے بہت متاثر ہوتیں۔ ان کی نظر میں وہ آئیڈیل شوہر تھا۔

دو برس گذر گئے' امتیاز کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا۔ دراصل صغیر چاہتا تھا اتنی چھوٹی عمر میں وہ اولاد کے بکھیڑوں میں نہ پڑے--- ان دونوں کے دن ابھی تک کھیلنے کودنے کے تھے۔ صغیر اسے ہر روز سینما لے جاتا' باغ کی سیر کراتا۔ نہر کے کنارے کنارے اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا۔ اس کی آسائش کا اسے خیال تھا۔ بہترین سے بہترین کھانے' اچھے سے اچھے

باورچی۔ اگر امتیاز کبھی باورچی خانے کا رخ کرتی تو وہ اس سے کہتا "تازی انگیٹھیوں پر پتھر کے کوئلے جلتے ہیں۔ ان کی بو بہت بری ہوتی ہے اور صحت کے لئے بھی نامفید۔۔۔ میری جان تم اندر نہ جایا کرو' دو نوکر ہیں۔ کھانے پکانے کا کام جب تم نے ان کے سپرد کر رکھا ہے تو پھر اس زحمت کی کیا ضرورت؟"

امتیاز مان جاتی۔

سردیوں میں صغیر کا بڑا بھائی اکبر جو نیروبی میں ایک عرصہ سے مقیم تھا اور ڈاکٹر تھا کسی کام کے سلسلے میں کراچی آیا تو اس نے سوچا کہ چلو لاہور صغیر سے مل آئیں۔ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچا اور اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ٹھہرا۔ وہ صرف چار روز کے لئے آیا کہ ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ پانچویں روز کے لئے بک تھی۔ مگر جب اس کی بھابی نے جو اس کی آمد پر بہت خوش ہوئی تھی اصرار کیا تو چھوٹے بھائی صغیر نے اس سے کہا "بھائی جان آپ اتنی دیر کے بعد آئے ہیں کچھ دن اور ٹھہر جایئے۔ میری شادی میں آپ شریک نہیں ہوئے تھے' جتنے دن آپ فالتو ٹھہریں گے' انہیں جرمانہ سمجھ لیجئے گا"۔

امتیاز مسکرائی اور اکبر سے مخاطب ہوئی "اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔۔۔ اور پھر مجھے آپ نے شادی پر کوئی تحفہ بھی تو نہیں دیا۔ میں جب تک وصول نہیں کر لوں گی' آپ کیسے جا سکتے ہیں اور آپ کو میں جانے بھی کب دوں گی"۔

دوسرے روز اکبر اس کو ساتھ لے کر گیا اور سچے موتیوں کا ایک ہار لے دیا۔ صغیر نے اپنے بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ اس لئے کہ ہار بہت قیمتی تھا' کم از کم پانچ ہزار روپے کا ہو گا۔

اسی دن اکبر نے واپس نیروبی جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور صغیر سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز میں اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دے۔ اس لئے کہ اس کی لاہور شہر میں کافی واقفیت تھی۔ اکبر نے اس کو روپے دیئے مگر اس نے برخوردارانہ انداز میں کہا "آپ ابھی اپنے پاس رکھئے میں لے لوں گا" اور ٹکٹ کا بندوبست کرنے چلا گیا۔

اسے کوئی دقت نہ ہوئی' اس لئے کہ ہوائی سروس کا جنرل مینجر اس کا دوست تھا۔ اس نے فوراً" ٹکٹ لے دیا۔ صغیر کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھا گپ لڑاتا رہا اس کے بعد گھر کا رخ کیا۔

موٹر گراج میں بند کر کے وہ اندر داخل ہوا' لیکن فوراً" باہر نکل آیا۔ گراج سے موٹر نکالی اور اس میں بیٹھ کر جانے کہاں روانہ ہو گیا۔

اکبر اور امتیاز دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آیا۔ انہوں نے موٹر کے آنے اور گراج میں بند کئے جانے کی آواز سنی تھی مگر انہوں نے سوچا کہ شاید ان کے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔ اس لئے صغیر موجود تھا نہ اس کی موٹر۔ مگر وہ غائب کہاں ہو گیا تھا؟

اکبر کو واپس جانا تھا مگر اس نے پورا ایک ہفتہ انتظار کیا۔ ادھر ادھر کئی جگہ پوچھ گچھ کی۔ پولیس میں رپورٹ لکھوائی مگر صغیر کی کوئی سن گن

نہ ملی۔ آخری دن جب کہ اکبر جا رہا تھا' پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ پی بی ایل کے ۱۰۰۵۹ نمبر کی موٹر کار جس کے ایک خانے میں صغیر اختر کے نام کا لائسنس نکلا ہے' ہوائی اڈے کے باہر کئی دنوں سے پڑی ہے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اکبر امجد حسین نام کے ایک آدمی نے آٹھ روز پہلے ہوائی جہاز میں نیروبی کا سفر کیا ہے--- اکبر کی سیٹ نیروبی کے لئے بک تھی۔ امتیاز سے رخصت لے کر جب وہ کینیا پہنچا تو اسے بڑی مشکلوں کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک صاحب جن کا نام اکبر امجد تھا ہوائی جہاز کے ذریعے سے یہاں پہنچے تھے۔ ایک ہوٹل میں دو روز ٹھہرے اس کے بعد چلے گئے۔

اکبر نے بہت کوشش کی مگر پتہ نہ چلا۔ اس دوران میں اس کو امتیاز کے کئی خط آئے۔ پہلے دو تین خطوں کی تو اس نے رسید بھیجی' اس کے بعد جو بھی خط آتا پھاڑ دیتا کہ اس کی بیوی نہ پڑھ لے۔

دس برس گزر گئے۔ امجد حسین' یعنی امتیاز کا باپ بہت پریشان تھا۔ بہت لوگوں کا خیال تھا کہ صغیر مر کھپ چکا ہے مگر امجد کا دل نہیں مانتا تھا۔ کہیں اس کی لاش ہی مل جاتی۔ خود کشی کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟--- بڑا نیک' شریف اور برخوردار لڑکا تھا۔ امجد کو اس سے بہت محبت تھی۔ ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ اس کی بیٹی امتیاز نے کہیں اس جیسے ذکی الحس آدمی کو ایسی ٹھیس نہ پہنچائی ہو کہ وہ شکستہ دل ہو کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس نے امتیاز سے کئی مرتبہ اس بارے میں پوچھا

مگر وہ صاف منکر ہو گئی۔ خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر اس نے اپنے باپ کی تشفی کر دی کہ اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ اکثر اوقات وہ روتی بھی تھی۔ اس کو صغیر یاد آتا تھا۔ اس کی نرم و نازک محبت یاد آتی تھی۔ اس کا وہ دھیما دھیما' نسیم سحری کا سلوک یاد آتا تھا جو اس کی فطرت تھی۔

امجد حسین کا ایک دوست حج کو گیا۔ واپس آیا تو اس نے اس کو یہ خوش خبری سنائی کہ صغیر زندہ ہے اور ایک عرصے سے مکے میں مقیم ہے۔ امجد حسین بہت خوش ہوا۔ اس کو اس کے دوست نے صغیر ہندی کا اتا پتا بتا دیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی امتیاز کو تیار کیا کہ وہ اس کے ساتھ حجاز چلے۔ فوراً" ہوائی جہاز کے سفر کا انتظام ہو گیا۔ امتیاز جانے کے لئے تیار نہیں تھی' اس کو جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

بہرحال باپ بیٹی سرزمین حجاز پہنچے۔ ہر مقدس مقام کی زیارت کی۔ امجد حسین نے ایک ایک کونہ چھان مارا مگر صغیر کا پتہ نہ چلا۔ چند آدمیوں سے معلوم ہوا جو اس کو جانتے تھے' صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ آپ کی آمد سے دس روز پہلے' کیونکہ اسے کسی نہ کسی طریق سے معلوم ہو چکا تھا کہ آپ تشریف لا رہے ہیں' کھڑکی سے کودا اور گر کر ہلاک ہو گیا۔ مرنے سے چند لمحات پہلے اس کے ہونٹوں پر ایک لفظ کانپ رہا تھا۔۔۔۔ غالباً" امتیاز تھا۔

اس کی قبر کہاں تھی۔ وہ کب اور کیسے دفن ہوا' اس کے متعلق صغیر کے جاننے والوں نے کچھ نہ بتایا۔ یہ ان کے علم میں نہیں تھا۔ امتیاز کو یقین

آگیا کہ اس کے خاوند نے خود کشی کر لی ہے۔ اس کو شاید اس کا سبب معلوم تھا' مگر اس کا باپ یہ ماننے سے یکسر منکر تھا۔ چنانچہ اس نے کئی بار اپنی بیٹی سے کہا "میرا دل نہیں مانتا--- وہ زندہ ہے--- وہ تمہاری محبت کی خاطر اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک خدا اس کو موت کے فرشتے کے حوالے نہ کر دے--- میں اس کو اچھی طرح سمجھتا ہوں--- تمہاری جگہ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھتا"۔

یہ سن کر امتیاز خاموش رہی۔

وہ سرزمین حجاز سے بے نیل و مرام واپس آگئے--- ایک برس اور گذر گیا۔ اس دوران میں امجد حسین بڑی مہلک بیماری' یعنی دل کے عارضے میں گرفتار ہوا اور وفات پا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی سے کچھ کہنا چاہا' مگر وہ بات شاید بڑی اذیت دہ تھی کہ وہ خاموش رہا اور صرف سرزنش بھری نگاہوں سے امتیاز کو دیکھتے دیکھتے مر گیا۔

اس کے بعد امتیاز اپنی بہن ممتاز کے پاس راولپنڈی چلی گئی۔ ان کی کوٹھی کے سامنے ایک اور کوٹھی تھی۔ جس میں ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو بہت تھکا تھکا سا دکھائی دیتا تھا دھوپ تاپتا اور کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔

ممتاز اس کو ہر روز دیکھتی--- ایک دن اس نے امتیاز سے کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ صغیر ہے--- کیا تم نہیں پہچان سکتی ہو۔ وہی ناک نقشہ ہے' وہی متانت وہ سنجیدگی"۔

ممتاز نے اس آدمی کی طرف غور سے دیکھا' اور ایک دم چلائی "ہاں

ہاں وہی ہے" پھر فوراً" رک گئی "لیکن وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو وفات پا چکے ہیں"۔

انہیں دنوں ان دونوں کی چھوٹی بہن شہناز بھی آ گئی۔ ممتاز اور امتیاز نے اس کو یہ قبل از وقت مرجھایا اور افسردہ مرد دکھایا جس کی ڈاڑھی کھچڑی تھی۔ اور اس سے پوچھا۔ "تم بتاؤ' اس کی شکل صغیر سے ملتی ہے یا کہ نہیں؟"

شہناز نے اس کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "شکل ملتی کیا ہے--- یہ خود صغیر ہے--- سو فی صدی صغیر"۔

اور یہ کہہ کر وہ سامنے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ وہ شخص جو کتاب پڑھنے میں مشغول تھا' چونکا۔ شہناز جس نے شادی کے موقعے پر اس کی جوتی چرائی تھی' اسی پرانے انداز میں کہا "جناب! آپ کب تک چھپے رہیں گے"۔

اس شخص نے شہناز کی طرف دیکھا اور بڑی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

شہناز طرار تھی۔ اس کے علاوہ اس کو یقین تھا کہ جس سے وہ ہم کلام ہے وہ اس کا بہنوئی ہے۔ چنانچہ اس نے بڑے نوکیلے لہجے میں کہا "جناب' میں آپ کی سالی شہناز ہوں"۔

اس شخص نے شہناز کو سخت ناامید کیا۔ اس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"۔

اس کے بعد شہناز نے اور بہت سی باتیں کیں مگر اس نے بڑے ملائم انداز میں اس سے جو کچھ کہا' اس کا یہ مطلب تھا کہ تم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔ میں تمہیں جانتا ہوں نہ تمہاری بہن کو جس کے متعلق تم کہتی ہو کہ میری بیوی ہے--- میری بیوی' میری اپنی زندگی ہے اور میں ہی اس کا خاوند۔

شہناز اور ممتاز نے لاکھ سر پٹکا' مگر وہ شخص جس کا نام راولپنڈی میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا' مانتا ہی نہیں تھا کہ وہ صغیر ہے--- اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی' سوائے کتابوں کے۔

لیکن شہناز اور ممتاز کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ امتیاز کے متعلق تمام معلومات حاصل کرتا ہے۔ ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا' اس پر اسرار مرد کے نوکر کے ذریعے سے کہ وہ راتوں کو اکثر روتا ہے' نمازیں پڑھتا ہے اور دعائیں مانگتا ہے وہ زندہ رہے--- وہ چاہتا ہے کہ اس کو جو اذیت پہنچی ہے اس سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہے۔

نوکر حیران تھا کہ انسان کی زندگی میں ایسی کون سی تکلیف ہو سکتی ہے جس سے وہ لطف اٹھا سکتا ہے--- سب باتیں امتیاز سنتی تھی اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ مرجائے۔ چنانچہ اس نے جب یہ سنا کہ وہ شخص جس کو امتیاز اچھی طرح پہچانتی تھی' اس کے نام سے قطعاً ناآشنا ہے تو اس نے ایک روز تولہ افیم کھالی اور یہ ظاہر کیا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اکیلی آرام کرنا چاہتی ہے۔

وہ آرام کرنے چلی گئی۔۔۔ لیکن شہناز نے جب اس کو غنودگی کے عالم میں دیکھا تو اسے کچھ شبہ ہوا۔ اس نے ممتاز سے بات کی۔ اس کا ماتھا بھی ٹھنکا کمرے میں جا کر دیکھا تو امتیاز بالکل بے ہوش تھی۔ اس کو جھنجھوڑا مگر وہ نہ جاگی۔ شہناز دوڑی دوڑی سامنے والی کوٹھی میں گئی اور اس شخص سے جس کا نام راولپنڈی میں کسی کو معلوم نہیں تھا' سخت گھبراہٹ میں یہ اطلاع دی کہ اس کی بیوی نے زہر کھا لیا ہے' اور مرنے کے قریب ہے۔ یہ سن کر صرف اس نے اتنا کہا "آپ کو غلط فہمی ہے' وہ میری بیوی نہیں ہے۔۔۔ لیکن میرے ہاں اتفاق سے ایک ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ آپ چلئے میں اسے بھیج دیتا ہوں"۔

شہناز گئی تو وہ اندر کوٹھی میں گیا' اور اپنے بھائی اکبر سے کہا "یہ کوٹھی جو سامنے ہے' اس میں کسی عورت نے زہر کھا لیا ہے۔۔۔ بھائی جان آپ جلدی جائیے اور کوشش کیجئے کہ بچ جائے"۔

اس کا بھائی جو نیروبی میں بہت بڑا ڈاکٹر تھا' امتیاز کو نہ بچا سکا۔ دونوں نے جب ایک دوسرے کو دیکھا تو اس کا رد عمل بہت مختلف تھا۔۔۔ امتیاز فوراً" مر گئی' اور اکبر اپنا بیگ لے کر واپس چلا گیا۔

صغیر نے اس سے پوچھا "کیا حال ہے مریضہ کا؟"

اکبر نے جواب دیا "مر گئی"۔

صغیر نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔۔۔ "میں زندہ رہوں گا"۔

لیکن ایک دم سنگین فرش پر لڑکھڑانے کے بعد گرا اور ---- جب
اکبر نے اس کی نبض دیکھی تو وہ ساکت تھی۔

اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی۔ اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کے ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحب روزگار تھا۔ مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی۔ ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔

زبیدہ بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا، بہت شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا۔ کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لئے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری

بی کا لٹھا، شنوں اور دو گھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی۔۔۔ ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سنی۔ اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔

اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر میں سوائے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ اسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بلا لے۔

علم الدین نے کہا ''اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہاری ماں میری ماں۔۔۔ جاؤ انہیں لے آؤ۔۔۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کئے دیتا ہوں''۔

زبیدہ بہت خوش ہوئی۔ گھر کافی بڑا تھا۔ دو تین کمرے خالی پڑے تھے وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی۔ علم الدین نے سامان اٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا، چنانچہ وہ بھی پہنچ گیا۔ زبیدہ کی ماں کے لئے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔

وہ بہت ممنون و متشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسن سلوک سے بہت متاثر۔ اس کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا، اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے۔ مگر وہ طبعاً'' کنجوس تھی۔

ایک دن میں نے اپنی بیٹی سے کہا "مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں--- میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا--- حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں--- اور زیور الگ"۔

زبیدہ انگیٹھی کے کوئلوں پر پھلکا سینک رہی تھی "ماں' تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو"۔

"کیسی ویسی میں نہیں جانتی--- میں نے یہ سب روپے علم الدین کو دے دیئے ہوتے' مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو--- تو یہ سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دوں---"

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا--- شادی ہوئے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے' مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔

وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں' کئی سفوف' کئی قرص اس کو کھلوائے' مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا۔ ٹونے ٹوٹکے استعمال کئے گئے تعویذ' دھاگے بھی--- مگر مراد بر نہ آئی۔ زبیدہ--- اس دوران میں تنگ آ گئی۔ ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا "چھوڑو اس قصے کو--- بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو---"

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا "بیٹا--- یہ بہت بڑا قصہ

ہے۔۔۔ تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے۔۔۔ اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا ہے"۔

زبیدہ نے پھلکا چنگیر میں رکھا "میں کیا کروں۔۔۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے"۔

بڑھیا نے کہا "قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔۔۔ بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیئے"۔

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کی گود ہری کرے، مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں، تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بنجر زمین ہے، جس میں کوئی پودا اگ ہی نہیں سکتا۔

راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔ بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحرا میں کھڑی ہے اس کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہے، جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔

کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔۔۔ بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگتی' اور وہ اپنی ماں سے کہتی "یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟"۔

اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی' جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا "کوئی بچہ رو نہیں رہا۔۔۔"

"نہیں ماں۔۔۔ رو رہا ہے۔۔۔ بلکہ رو رو کے ہلکان ہوئے جا رہا ہے"۔

اس کی ماں نے کہا "یا تو میں بہری ہو گئی ہوں' یا تمہارے کان بجنے لگے ہیں"۔

زبیدہ خاموش ہو گئی' لیکن اس کے کانوں یں دیر تک کسی نوزائیدہ بچے کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اور اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے نہ کیا۔ لیکن جب وہ اندر اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے گئی تو اس نے قمیض اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر ٹپکتی رہی۔۔۔ لیکن وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب واہمہ ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ پر مسلسل ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے' جو کسی

بیاہی عورت کی زندگی میں نہیں ہونا چاہئے۔

وہ اب بہت اداس رہنے لگی۔۔۔ محلے میں بچے شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علم الدین کو اولاد ولاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا۔ کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہشیار تھا' اس لئے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دوگنا ہو گئی تھی۔

مگر اس آمدنی کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جب اس کا شوہر نوٹوں کی گڈی اس کو دیتا' تو اسے اپنی جھولی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی۔۔۔ پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولنے میں بٹھا دیتی۔

ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیئے تھے' دودھ کی پتیلی میں پڑے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا "یہ نوٹ دودھ کی پتیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟"

زبیدہ نے جواب دیا "بچے بڑے شریر ہیں' یہ حرکت انہی کی ہو گی"۔

علم الدین بہت متحیر ہوا "لیکن یہاں بچے کہاں ہیں؟"

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی "کیا ہمارے ہاں بچے

نہیں--- آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں--- ابھی اسکول سے واپس آتے ہوں گے--- ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی"۔

علم الدین سمجھ گیا۔ اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں۔ لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔

وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ مگر اس کا علاج اس کے بس میں نہین تھا۔ اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرا دو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا۔ سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا، کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہو گئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، غبن تو نہیں کر رہا۔

اس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا "دکان پر تم کیوں نہیں جاتے؟"

علم الدین نے اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "جانم--- میں کام کر کے تھک گیا ہوں، اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر دکان کس کے سپرد ہے؟"

"میرا نوکر ہے--- وہ سب کام کرتا ہے"۔

"کیا ایماندار ہے؟"

"ہاں' ہاں--- بہت ایماندار ہے--- دمڑی دمڑی کا حساب دیتا ہے--- تم کیوں فکر کرتی ہو"۔

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا "مجھے کیوں فکر نہ ہو گی بال بچے دار ہوں۔ مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں' لیکن ان کا تو ہے--- یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھئے کہ بچوں---"

علم الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے "زبیدہ--- ان کا اللہ مالک ہے۔ویسے میرا نوکر بہت وفادار ہے اور ایماندار ہے۔ تمہیں کوئی تردد نہیں کرنا چاہئے"۔

"مجھے تو کسی قسم کا تردد نہیں ہے' لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے"۔

علم الدین بہت پریشان تھا۔ کہ کیا کرے۔ زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ ان کی جرابیں دھوتی' ان کے لئے اونی سویٹر بنتی۔ کئی بار اس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈلیں منگوائیں' جن کو وہ ہر صبح پالش کرتی تھی"۔

علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے' اس کا علم' علم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا۔ علم

الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشقہ ہو گیا تھا۔ اب وہ حاملہ ہو گئی ہے۔ اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کئے گئے ہیں' مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا "دیکھو' اسقاط وسقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو"۔

اس کے دوست نے جسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' کہا "میں بچے کا کیا کروں گا؟"

"تم مجھے دے دینا"۔

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا۔

زبیدہ بار بار کہتی "مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہئے' پہلے ہی کیا کم ہے"۔

علم الدین خاموش رہتا۔

اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا' جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس' جو کہ سو رہی تھی' لٹا دیا۔۔۔ اور اسے جگا کر کہا "زبیدہ' تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی۔ یہ دیکھو' تمہارے پہلو میں کیا ہے"۔

"زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا منا بچہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ علم الدین نے اس سے کہا "لڑکا ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں"۔

زبیدہ بہت خوش ہوئی "یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟"

"صبح سات بجے"۔

"اور مجھے اس کا علم ہی نہیں--- میرا خیال ہے' درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی ہوں گی"۔

علم الدین نے کہا "ہاں' کچھ ایسی ہی بات تھی' لیکن اللہ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو گیا"۔

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لہولہان ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے۔ وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔

علم الدین نے اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا' "یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا "ساری رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا--- لعنت ہے ایسی---"۔

اس سے آگے' وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی' اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

موچنا

نام اس کا مایا تھا۔ ناٹے قد کی عورت تھی۔ چہرہ بالوں سے بھرا ہوا۔ بالائی لب پر تو بال ایسے تھے' جیسے آپ کی اور میری مونچھوں کے۔ ماتھا بہت تنگ تھا' وہ بھی بالوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو موچنے کی ضرورت اکثر پیش آتی تھی۔

وہ راولپنڈی کے ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس سے قطع تعلق کئے اسے ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے' کہ وہیں اس کی شادی ہوئی۔ جب اس کی عمر سولہ برس کے قریب تھی۔ دو برس ہونے کو آئے تو اس کے خاوند کو شک گزرا کہ مایا کا چال چلن خراب ہے۔ محلے میں وہ ایک نہیں' تین آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی ہے۔

اس تگڈے عشق کے دوران میں مایا کو احساس ہوا کہ اس کا ماتھا تنگ ہے۔ اس کے بالائی لب اور ٹھوڑی پر بال ہیں جو بڑے بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک موچنا خرید لیا اور ان غیر ضروری بدنما بالوں

کا صفایا کر دیا۔ لیکن وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دفعہ بال نوچنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے ان سے نجات حاصل کر لے گی۔ اس کو موچنے سے ماتھے، ٹھوڑی اور بالائی لب کے بال اکھیڑنے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ ایک ایک کر کے ہر بال کو موچنے کی گرفت میں لینا اور پھر اسے ایک ہی جھٹکے میں باہر نکالنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر مایا دھن کی پکی تھی۔ یہ کام گو خود اس کے اپنے ہاتھ کر رہے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ درد کے مارے بلبلا اٹھتی تھی۔

جب سارا میدان صاف ہو گیا تو اس نے اطمینان کا بہت لمبا سانس لیا تھا۔۔۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ کم بخت دوسرے ہی روز پھر نمودار ہو جائیں گے۔۔۔ چنانچہ جب انہوں نے اس کے چہرے کی جلد سے اپنا سر نکالا تو مایا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، کہ وہ ہر چوتھے پانچویں روز اپنے غیر ضروری بالوں کی صفائی کیا کرے۔۔۔ آہستہ آہستہ موچنا اس کی زندگی کا اہم ترین جزو بن گیا۔ وہ جہاں بھی جاتی موچنا اس کے ساتھ ہوتا۔۔۔ لیکن اس کے استعمال میں اسے ان دنوں سخت دقت محسوس ہوتی جب کہ وہ کسی دوسرے کے گھر ہوتی۔ اپنے گھر میں بھی اسے سب کی نظر بچا کر کسی ایسی جگہ اپنے بال نوچنے پڑتے تھے، جہاں کسی کے گزر کا امکان نہ ہو۔ پھر بھی کوئی پتا کھڑکتا تھا تو وہ بھڑک اٹھتی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا گناہ کر رہی ہے۔

"منٹو صاحب میں اب سوچتا ہوں کہ اس سے ایسا کونسا گناہ سرزد ہوا تھا جو خدا نے اس کے مونچھیں اور داڑھی اگا دی تھیں۔ اس کا ماتھا اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ اس کی گھنی بھوؤں کے ساتھ آگے مل گیا تھا۔ اس کے سارے بدن پر بھی بال ہی بال تھے۔ معلوم نہیں کیوں--- بال--- روئیں نہیں--- اچھے تکڑے بال--- سیاہ۔ آپ یقیناً" کہئے گا کہ پھر اس میں ایسی کونسی جاذبیت تھی کہ تم اس پر لٹو ہو گئے اور بہت دیر تک لٹو رہے۔ سو عرض ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا"۔

میں نے شکیل کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"آپ اتنے بڑے شاعر ہیں' جب وہ آپ کے پاس تھی تو آپ نے بڑی خوبصورت غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ جن میں مایا کا پرتو لفظ لفظ میں ملتا ہے۔ جب وہ چلی گئی تو آپ نے پھر بڑی زہریلی زہریلی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ ان میں بھی مایا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ آپ کا اس پر لٹو ہونے کا باعث کیا تھا؟"

شکیل نے ماتھے کا پسینہ پنسل سے ایک طرف ہٹا کر صاف کیا۔

"مایا--- صرف مایا--- اور--- مایا کیا تھی--- یہ خدا کی قسم میں نہیں جان سکا۔ میری شاعری پر لعنت بھیجئے کیونکہ وہ محض جذباتی تھی--- اس میں بھی وہی مایا کار فرما تھی۔ جس پر میں بظاہر بے وجہ لٹو ہوا تھا--- لیکن---" شکیل ایک لمحے کے لئے مناسب و موزوں الفاظ تلاش کرنے کے لئے رک گیا۔

"وہ بستر کی بہترین رفیق تھی"۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شکیل کا یہ بیان بہت حد تک درست تھا۔ مایا ایک نچی ہوئی مرغی تھی۔ اس کے مقابلے میں شکیل کی سہرے جلووں کی بیاہی ہوئی عورت پٹھانی حسن کا بہترین نمونہ تھی۔۔۔ گو وہ بچوں کی ماں' مگر شاید وہ بستر کی اچھی رفیق نہیں تھی۔

مایا شادی شدہ تھی مگر اولاد سے محروم۔ اس کے راولپنڈی میں کئی سلسلے ہو چکے تھے' مگر ان سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔۔۔ اس کے ماتھے اس کے بالائی لب اور اس کی تھوڑی کے بال بڑھتے جا رہے تھے اور موچنے کے کام میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ راولپنڈی میں جب اس نے کھیل کھیلنا شروع کیا تو اس کا خاوند جو کہ ایک شریف آدمی تھا' متوسط درجے کا دوکاندار' غربت کا مالک' اور ہٹ کا پکا تو اس نے ایک دن مایا کو گھر سے باہر نکال دیا۔ مایا نے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ البتہ دوسرے دن میکے سے اپنے شوہر کو خط لکھا کہ وہ مہربانی کر کے اس کا موچنا بھیج دے۔۔۔

اس کے شوہر گنڈا سنگھ نے بصد مشکل موچنا تلاش کیا اور آئینہ سمیت مایا کو بھجوایا۔ مایا کے زیور وغیرہ جو اس کے پاس رہتے تھے اسی کے پاس رہے۔ مایا نے ان کا مطالبہ کبھی نہ کیا۔

اس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ ایک مسلمان گھڑی ساز کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک برس کے اندر اندر اس نے مایا کو کئی زیور بنوا دیئے۔ ایک گھڑی جو کسی گاہک کی

تھی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ یہ بہت بیش قیمت گھڑی تھی۔ جب گاہک نے اس کا مطالبہ کیا تو صاف مکر گیا۔۔۔۔ اس نے یہ کہا صریحاً" غلطی ہوئی ہے' ورنہ شہاب الدین کی یہ دکان۔

وہ عورت جس کی یہ گھڑی تھی کوئی شریف عورت تھی۔ یہ سن کر خاموش ہو کر چلی گئی۔ شہاب الدین باوجود اس کے کہ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا' زبردستی خوش ہونے کی کوشش کرتا۔ جب گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مایا دیوی جس کا اسلامی نام اس نے حسب توفیق اور بقدر جذبات صغریٰ رکھا ہوا تھا پڑوس کے گھر میں ہے' جو شہر کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔

اب شہاب الدین گھڑی ساز کے گھر سے مایا کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ پڑوس میں امین پڑنگ کے یہاں چلی گئی۔معمولی سا جھگڑا ہوا تھا۔ مایا کے سارے کپڑے وہیں پڑے رہے' لیکن وہ اپنا موچنا ساتھ لیتی گئی۔

امین پڑنگ بڑا نہنگ قسم کا آدمی تھا۔ اس نے مایا سے صاف صاف کہہ دیا، "دیکھو اگر تم نے پھر کوئی ایسا ویسا معاملہ کیا تو یاد رکھو میں تمہاری گردن اس چاقو سے کاٹ ڈالوں گا"۔

وہ ہر وقت اپنی جیب میں ایک بڑا خوفناک کمانی والا چاقو رکھتا تھا۔ مگر مایا اس سے بالکل خائف نہ ہوئی۔ امین پڑنگ کا ایک نوجوان لڑکا یوسف تھا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ چند دنوں ہی میں اس نے اس نوجوان کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ امین کام پر جاتا تو یوسف کالج سے غیر حاضر ہو کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔۔۔ آخر ایک روز بھانڈا پھوٹ گیا۔ باپ بیٹے کی مڈبھیڑ ہوئی۔ قریب تھا

کہ وہ اس کے پیٹ میں اپنی کمانی والا چاقو بھونک کر اس کا خاتمہ کر دے کہ مایا نے حکمت عملی سے کام لے کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور تین کپڑوں میں وہاں سے نکل گئی۔

سنا ہے کہ امین پڑنگ اس کے جانے کے بعد بہت دیر مغموم رہا۔۔۔ دوستوں میں وہ ہر وقت اس کی باتیں کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مایا سے اس کی اتفاقی ملاقات ہو جاتی تو اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ کپڑے رنگنے چھوڑ کر وہ سارا دن وارث شاہ کی "ہیر" سنا کرتا تھا۔

مجھے صرف یہاں تک مایا کے متعلق معلوم تھا۔ چنانچہ مزید معلومات کے لئے میں نے شکیل سے جو کہ اپنی داستان بیان کر رہا تھا پوچھا۔

"امین پڑنگ کے بعد وہ کس کے پاس گئی؟"

شکیل نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا "ہزاروں کے پاس۔۔۔ لاری ڈرائیور ہربنس سنگھ کے پاس، سینما اپریٹر مکند لال کے پاس۔۔۔ دیال سنگھ کالج کے ایک پروفیسر کے پاس۔۔۔ سٹار بیکری کے مالک حسین بخش کے پاس۔۔۔ ایکسٹرا سپلائز غلام محمد کے پاس"۔

شکیل کے ہونٹوں پر ابھی تک وہ زہر خند موجود تھا۔ "ایک برس میں۔۔۔ جو کہ اس نیک بخت کے لئے بہت بڑا عرصہ تھا۔۔۔ اور"۔

اس نے میری طرف بڑی معنی نگاہوں سے دیکھا جو کہ زخم خوردہ تھیں۔ "آپ کو معلوم ہے، ہر مرتبہ اپنے نئے یار سے جدا ہونے کے بعد اس نے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ درخواست کی تھی کہ اس کا موچنا اس کو

بھیج دیا جائے"۔

میں کباب ہو گیا۔۔۔ موچنے میں آخر ایسی کونسی بات تھی کہ مایا اور تمام چیزیں چھوڑ کر صرف اسی کی واپسی کی درخواست کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے شکیل سے پوچھا۔

"یہ موچنا سونے کا تھا۔۔۔ جڑاؤ تھا؟"

شکیل مسکرایا۔ "جی نہیں۔۔۔ معمولی لوہے کا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی قیمت چار آنے ہو گی۔ مگر وہ اس کا دائمی رفیق بن گیا تھا۔ کم بخت نے کسی مرد کو دائمی رفیق نہیں بنایا تھا۔ مگر یہ موچنا اس کا جیون ساتھی تھا"۔

امین پڑنگ کو معلوم تھا کہ موچنا کہاں پڑا ہے۔ اس نے پہلے سوچا کہ گول کر دے اور لڑکے کے ایک دھول رسید کر کے رخصت کر دے۔۔۔ یا اس کے سر پر استرا پھروا کر واپس بھیج دے کہ موچنے نے اتنا کام کیا ہے کہ وہ اب کسی کام کا نہیں رہا۔۔۔ مگر پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے کانس پر سے موچنا اٹھایا۔۔۔ اس کے دانتوں میں سے مایا کی بھوؤں کے چند بال نکالے اور ایک طرف پھینک دیئے۔۔۔ امین پڑنگ باوجود اس کے کہ بہت بڑا غنڈہ تھا، موچنے کو دیکھ کر موم ہو گیا۔ اور اس نے قاصد لڑکے کا سر منڈوانے کا خیال ترک کر دیا۔

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ وہ امین پڑنگ کے بعد کس کے پاس گئی۔ لیکن شکیل نے مجھے فوراً بتا دیا۔ "منٹو صاحب وہ ایک مرد کی

عورت نہ تھی۔ لیکن شاید یہ کہنا بھی درست نہیں۔ وہ ایسی میل تھی جو ہر اسٹیشن پر ؟ ؟ کوئلہ پانی چاہتی ہے۔۔۔ امین کے بعد وہ اسسٹنٹ فلم ڈائریکٹر ہربنس سنگھ کے پاس تین مہینے رہی۔ پھر ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی۔ این آہوجہ کے پاس ایک ماہ اور چند دن۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد"۔

میں نے پوچھا' کس کے پاس؟"

شکیل نے شرما کر جواب دیا' "آپ کے اس خاکسار کے پاس' جسے دارا شکوہ المعروف شکیل کہتے ہیں۔۔۔ لعنت ہو اس پر ہزار بار"۔

میں نے دریافت کیا "آپ اس لعنت میں کیسے گرفتار ہوئے؟"

شکیل نے ٹھیٹ پشاوری لہجے میں کہا "منٹو صاحب۔۔۔ وہ لعنت ایسی ہے کہ اس میں گرفتار ہوئے بنا کوئی نہیں رہ سکتا۔۔۔ آپ بڑے آہنی قسم کے مرد بنے پھرتے ہیں' لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسے دیکھتے تو یقیناً" اپنی ساری افسانہ نگاری بھول جاتے۔۔۔ اگر نہ بھولتے تو قلم کے بجائے موچنے سے افسانے لکھتے۔ یوں کہئے کہ آپ ادب کی مونچھوں کے بال اکھیڑنے میں ساری عمر صرف کر دیتے"۔

ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوتا' کیونکہ میں بھی امین' شکیل اور گنڈا سنگھ کی طرح ایک انسان ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا' کہ موچنے میں کیا خصوصیت تھی کہ وہ مایا کی زندگی کے ساتھ ایسی بری طرح چپک گیا تھا۔

میں نے شکیل سے کہا "تمہارا اس کا سلسلہ کتنی دیر تک قائم رہا؟"

شکیل نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ سلگایا۔ قریب قریب دو برس تک" اور--- وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا "اور منٹو صاحب آپ یقین مانئے' میں دنیا ومافیہا کو بھول گیا"۔

میں نے سوال کیا "کیوں؟"

شکیل سوچنے لگا--- "کچھ نہیں کہہ سکتا--- شاید--- شاید اس کی مونچھوں کے بال--- جو موچنے کے استعمال سے بڑے کھردرے ہو گئے تھے--- وہ--- وہ--- بڑی حرارت پیدا کرتے تھے--- اور اس کا جسم جو سر سے پیر تک بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ منٹو صاحب میں شاعر ہوں۔ میں نے ہمیشہ نرم اور چکنے بدن کی تعریف کی ہے' جس پر سے آدمی پھسل پھسل جائے۔ مگر مایا کی دوستی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب بکواس ہے' سارا مزہ اٹک اٹک جانے میں ہے--- بس میں صرف اتنا جانتا ہوں"۔

میں سوچنے لگا۔ پھسل پھسل جانے اور اٹک اٹک جانے میں واقعی بہت بڑا نفسیاتی فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے خود سمجھ سکتے ہیں--- اگر نہیں سمجھ سکتے تو اس بکھیڑے میں نہ پڑیئے۔

شکیل صاحب کی گفتگو کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مایا کو قریب قریب بھول چکے ہیں' مگر پھر بھی اس کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔

"شکیل صاحب--- دو برس تک آپ کا اور مایا کا سلسلہ رہا---"

شکیل نے میری بات کاٹ کر کہا "جی ہاں--- دو برس تک---

میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا--- اپنے بچوں سے منہ موڑ لیا اور مایا کو اپنے سینے سے لگا لیا--- لیکن دو برس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ بے وفا ہے--- ریاکار ہے"۔

میں نے پوچھا "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

شکیل نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ "جناب--- وہ میرے ہمسائے شیخ اسماعیل گورنمنٹ کنٹریکٹر سے اپنا نیا سلسلہ قائم کر رہی تھی۔ مجھے اور کسی بات کا غصہ نہیں تھا منٹو صاحب' لیکن وہ سالا پچاس برس کا بوڑھا تھا--- سات جوان لڑکیوں کا باپ۔ دو بیویوں کا خاوند--- لیکن حیرت اس سالی پر بھی ہے کہ اسے کیا سوجھی؟"

شکیل نے یہ کہہ کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کی' مگر اس سے سلگ نہ سکا۔ اس لئے کہ اس کے ہاتھ بہت بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لیا اور سلگا کر اس کو دیا "وہ چلی گئی"۔

"جی ہاں میں نے اسے دھکے مار کر باہر نکال دیا"۔ شکیل نے زور کا ایک کش لیا' اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے پنسل پکڑ کر ایک نئی نظم لکھنے کے لئے تیار ہونے لگا جو غالباً" مایا کی یاد کے بارے میں ہونے والی تھی۔

"جی ہاں چلی گئی--- یہ اپنا موچنا چھوڑ گئی"۔

میں نے پوچھا "اس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا؟"

شکیل نے ایک اور کش لیا' "ایک نہیں' سینکڑوں مرتبہ--- لیکن میں نے اسے واپس نہیں کیا--- اس لئے کہ ایک صرف یہی چیز ہے جو اس

کے اور میرے درمیان رہ گئی ہے۔ جب تک یہ موچنا میرے پاس ہے وہ ہمیشہ مجھ سے خط و کتابت کرتی رہے گی"۔

نواب کاشمیری

یوں تو کہنے کو ایک ایکٹر تھا' جس کی عزت اکثر لوگوں کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہوتی جس طرح مجھے بھی محض افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ایک فضول سا آدمی۔ پر یہ فضول سا آدمی اس فضول سے آدمی کا جتنا احترام کرتا تھا وہ کوئی بے فضول شخصیت' کسی بے فضول شخصیت کا اتنا احترام نہیں کر سکتی۔

وہ اپنے فن کا بادشاہ تھا۔ اس فن کے متعلق آپ کو یہاں کا کوئی وزیر کچھ بتا نہ سکے گا۔ مگر کسی چیتھڑے پہنے ہوئے مزدور سے پوچھیں جس نے چونی دے کر نواب کاشمیری کو کسی فلم میں دیکھا ہے تو وہ اس کے گن گانے لگے گا۔ وہ آپ کو بتائے گا (اپنی عام زبان میں) کہ اس نے کیا کمال دکھائے۔

انگلستان کی یہ رسم ہے کہ جب ان کا کوئی بادشاہ مرتا ہے تو فوراً اعلان کیا جاتا ہے۔ ''بادشاہ مر گیا۔۔۔ بادشاہ مر گیا ہے۔ بادشاہ کی عمر دراز ہو''۔

نواب کاشمیری مر گیا ہے' لیکن میں کس نواب کاشمیری کی درازی کے لئے دعا مانگوں۔ مجھے تو اس کے مقابلے میں تمام کردار نگار پیادے معلوم ہوتے ہیں۔

نواب کاشمیری سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی۔

بمبئی کے ایک اسٹوڈیو میں ہم دیر تک بیٹھے اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے اس کو اپنی ایک فلمی کہانی سنائی' لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے بلا تکلف کہہ دیا:۔

"ٹھیک ہے' لیکن مجھے پسند نہیں"۔

میں اس کی اس بے باک تنقید سے بہت متاثر ہوا۔ دوسرے روز میں نے اسے پھر ایک کہانی سنائی۔ سننے کے دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ جب میں نے کہانی ختم کی تو اس نے رومال سے آنسو خشک کر کے مجھ سے کہا:۔

"یہ کہانی آپ کس فلم کمپنی کو دے رہے۔ بھڑوے کا رول مجھے بہت پسند ہے"۔

میں نے اس سے کہا' "یہ کہانی کوئی پروڈیوسر لینے کے لئے تیار نہیں"۔

نواب نے کہا "تو لعنت بھیجو ان پر۔۔۔"

نواب مرحوم کو پہلی بار میں نے "یہودی کی لڑکی" میں دیکھا تھا۔ جس میں رتن بائی ہیروئن تھی۔ نواب عذرا یہودی کا پارٹ کر رہے تھے۔

میں نے اس سے پہلے یہودیوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن جب بمبئی گیا، تو یہودیوں کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ نواب نے ان کا صحیح، سو فیصد صحیح چربہ اتارا ہے۔ جب نواب مرحوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ عذرا یہودی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے اس نے کلکتہ میں یہ پارٹ ادا کرنے سے پہلے کئی یہودیوں ے ساتھ ملاقات کی۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا رہا اور جب اس نے محسوس کیا وہ یہ رول لوا کرنے کے قابل ہو گیا ہے تو اس نے مسٹر بی۔ این سرکار مالک نیو تھیٹر سے ہامی بھر لی۔

جن اصحاب نے "یہودی کی لڑکی" فلم دیکھا۔ ان کو نواب کاشمیری کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس نے بوڑھا بننے کے لئے اور پوپلے منہ سے باتیں کرنے کے لئے اپنے سارے دانت نکلوا دیئے تھے تاکہ کردار نگاری پر کوئی حرف نہ آئے۔

وہ اب بہت بڑا کردار نگار تھا۔ وہ کسی ایسے فلم میں حصہ لینے کے لئے تیار نہ تھا جس میں کوئی ایسا رول نہ ہو، جس میں وہ سما سکتا ہو۔ چنانچہ وہ کسی فلم کمپنی سے معاہدہ کرنے سے پہلے پوری کہانی سنتا تھا۔ اس کے بعد گھر جا کر اس پر کئی دن غور کرتا تھا۔۔۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر مختلف جذبات پیدا کرتا تھا۔۔۔ جب اپنی طرف سے مطمئن ہو جاتا تو معاہدہ پر دستخط کر دیتا۔

اس کو آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں سے بہت محبت تھی۔ مگر تعجب ہے کہ یہ شخص جو عرصے تک امپیریل تھیٹریکل کمپنی کے ڈراموں میں اسٹیج

پر آتا رہا اور داد و تحسین وصول کرتا رہا' فلم میں آتے ہی ایک دم بدل گیا۔ اس کے لب و لہجے میں کوئی تھیٹرپن نہیں تھا۔ وہ اپنے مکالمے اسی طرح ادا کرتا تھا جس طرح کہ لوگ عام گفتگو کرتے ہیں۔

جس تھیٹریکل کمپنی کا میں نے ذکر کیا ہے' اس میں نواب مرحوم نے "خوبصورت بلا" "نور وطن" اور "باغ ایران" میں اپنی اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

نواب کاشمیری لکھنؤ کے بڑے امام باڑے کے سید مفتی اعظم کے اکلوتے لڑکے تھے۔ قدرت کی یہ کتنی ستم ظریفی ہے۔ کہاں امام باڑے کا مفتی اعظم اور کہاں منڈوہ۔ لیکن بچپن ہی سے اس کو ناٹک سے لگاؤ تھا۔

لکھنؤ میں ایک ناٹک کمپنی آئی جس کا مالک اگروال تھا۔ اس کمپنی کے کھیل نواب باقاعدہ دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سلسلے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کھیل دیکھ کر گھر آتا تو گھنٹوں اس ڈرامے کے یاد رہے ہوئے مکالمے اپنے انداز میں بولتا۔

اس ناٹک کمپنی میں چنانچہ ایک مرتبہ خود کو پیش کیا کہ وہ اس کا امتحان لیں۔ ڈائریکٹر نے جب نواب کی ایکٹنگ دیکھی اور مکالمے کی ادائیگی سنی تو حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے فوراً اسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی تنخواہ کیا مقرر ہوئی۔

اس کمپنی کے ساتھ نواب کلکتہ پہنچے' اور اپنے مزید جوہر دکھائے۔ کاؤس جی کھٹاؤ جی نے ان کی اداکاری دیکھی تو ان کو الفریڈ تھیٹرز کمپنی میں

لے لیا۔ ان دنوں وہ کریکٹر مشہور ہو گئے۔

سیٹھ سکھ لال کرنانی جو الفریڈ تھیٹر کے مالک تھے' اور پرلے درجے کے گدھے اور بیوقوف تھے۔ انہوں نے اپنے حواریوں سے سنا کہ ایک ایکٹر جس کا نام نواب ہے' کمال کر رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے' تو انہوں نے اپنے ٹھیٹ انداز گفتگو میں کہا "تو لے آؤ اس سانڈ کو"۔

وہ سانڈ آگیا۔۔۔ اور وہ سانڈ نواب کاشمیری تھا۔ اس کو زیادہ تنخواہ دے کر اپنے یہاں ملازم رکھا۔ وہ دیر تک میرا مطلب ہے دو سال تک کرنانی صاحب کی کمپنی کے کھیل میں کام کرتے رہے۔

مجھے یاد نہیں کون سا سن تھا۔۔۔ غالباً" یہ وہ زمانہ تھا جب بمبئی کی "امپیریل فلم کمپنی" نے ہندوستان کا پہلا بولتا فلم "عالم آرا" بنایا تھا۔

جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو مسٹر بی۔ این سرکار جو بڑے تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ انہوں نے جب نیو تھیٹرز کی بنیاد رکھی تو نواب کاشمیری کو جس سے وہ اکثر ملتے جلتے تھے' اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ تھیٹر چھوڑ کر فلمی دنیا میں آجائے۔

بی۔ این سرکار نواب کو اپنا ملازم نہیں محبوب سمجھتے تھے۔ ان کا ذوق بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ وہ آرٹ کے گرویدہ تھے۔ نواب مرحوم کا پہلا فلم "یہودی کی لڑکی" تھا۔ اس فلم کی ہیروئن رتن بائی تھی جس کے سر کے بال اس کے ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر ایک بنگالی مسٹر اتھار تھی تھے۔ (جو اب دنیا تیاگ چکے ہیں) اس ٹیم میں حافظ جی اور میوزک ڈائریکٹر

بالی تھے۔ اس تنگڑھم میں کیا کچھ ہوتا تھا' میرا خیال ہے اس مضمون میں جائز نہیں۔

مسٹر اٹھارتھی نے جو بہت پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے' مجھ سے کہا کہ نواب ایسا ایکٹر پھر کبھی پیدا نہیں ہو گا۔ وہ اپنے رول میں دھنس جاتا ہے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔ وہ اپنے فن کا ماسٹر ہے۔

حافظ جی بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اچھا ایکٹر کبھی نہیں دیکھا۔

خیر! ان باتوں کو چھوڑیئے---- میں اب نواب ایکٹر کی طرف آتا ہوں۔

ایک فلم میں جس کا عنوان غالباً" "مایا" تھا۔ مرحوم کو جیب کترے کا پارٹ دیا گیا۔ اس نے جب ساری کہانی سنی تو صاف کہہ دیا کہ میں یہ رول ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میں جیب کترا نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کسی کی جیب نہیں کاٹی---- لیکن وہ کلکتے کے ایک واہیات ہوٹل میں ہر روز جاتا رہا۔ وہاں اس کی کئی جیب کتروں اور اٹھائی گیروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں---- سنا ہے کہ ان کے ساتھ اس نے شراب بھی پی---- حالانکہ اسے اس کی عادت نہیں تھی۔ ایک ہفتے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ چنانچہ اس نے فلم کمپنی کے مالک سے کہہ دیا کہ وہ جیب کترے کا رول ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔

اس نے اس دوران میں کئی بدمعاشوں اور بدکرداروں سے دوستی پیدا

کر لی تھی۔ ان کے تمام خصائص اس نے سیکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس رول میں کامیاب رہا۔ مرحوم کی زندگی یوں بڑی پاک صاف تھی۔ ان کے ایک عزیزم اے۔ ایم عماد ہیں' انہوں نے مجھے بتایا کہ نواب بڑا طہارت پسند تھا۔ شیعہ تھا۔ کوئی کام بغیر استخارے کے نہیں کرتا تھا۔ سنی اور شیعہ ہونے میں کیا فرق ہے۔ لیکن جب ان دو فرقوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے دماغوں میں مذہبی فتور ہے۔ میں تو نواب مرحوم کی بات کر رہا تھا۔۔۔ میں وہ مکتی کا "سین" کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب اس نے اپنی بدچلن بیوی کو بھنے ہوئے چنے دیئے۔۔۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اتنا غم و اندوہ تھا جو چہرہ بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔

"دیوداس" میں جب سہگل اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے تو وہ کچھ دیر اپنا چہرہ سہلاتا ہے۔ جہاں ضرب آئی ہے' اور صرف اتنا کہتا ہے:۔

"تم نے دیبو بھائی کو مارا"۔

۔۔۔ اور۔۔۔ اور اب میں کیا کہوں۔۔۔ سارے حساس تماشائی لرز جاتے ہیں۔

فلم "ضدی" میں جب اس کے بھتیجے کی بیوی (کلدیپ کور) اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہ غصے کے عالم میں (پران ایکٹر سے) جا رہی ہوتی ہے۔ نواب کاشمیری مرحوم "انویلڈ چیئر" میں بیٹھا ہے۔۔۔ اس کو دیکھتا ہے۔۔۔ اور عجیب فلسفیانہ انداز میں ہم کلامی کرتا ہے۔ "پھر وہ۔۔۔ چلی گئی"۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن آپ کو فی الحال یہ بتا دینا چاہتا ہوں جو غالباً ابھی تک کسی پرچے میں شائع نہیں ہوا کہ اس کی پہلی بیوی اپنے وطن کی تھی۔ اس لڑکی سے اس کی کب شادی ہوئی؟ اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

اس بیوی سے اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جب اس طرف سے ناامیدی ہوئی تو نواب نے ادھر ادھر کسی دوسرے رشتے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ آخر پرنس مہر قدر (بادشاہ اودھ) کے بڑے لڑکے کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔

جب یہ شادی ہوئی تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ نواب نے کوئی پرواہ نہ کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ اس کی پہلی بیوی نے خود کشی کر لی۔ اب آپ اس خود کشی کا مختصر حال سن لیجئے۔ جب اس کی پہلی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی ہے تو اس نے نوکرانی سے توشک منگوائی۔ اس پر مٹی کا تیل چھڑکا۔۔۔ اس کے بعد تن بدن پر بھی یہی تیل ملا۔۔۔ اپنے کپڑوں کو بھی اس سے مانوس کیا۔ پھر آرام سے چارپائی پر لیٹ کر دیا سلائی جلائی اور خود کو آگ لگا دی۔۔۔ وہ مر گئی۔ نواب کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیوی کوئلہ بن گئی ہے۔ وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ دوسرے گھر میں تھا۔

جب نواب کو معلوم ہوا کہ وہ مر گئی ہے تو اس نے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ آخری وقت پر وصیت کر

گئی تھی کہ اپنی دس ہزار کی انشورنس پولیسی میں اپنے خاوند کے نام سپرد کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک سو ساٹھ تولے سونا بھی میں ان کی تحویل میں دیتی ہوں۔

نواب یہ وصیت سن کر بہت متعجب ہوا۔

اسے دیر تک مٹی کے تیل کی بو آتی رہی۔

میں اب بھی سوچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں مٹی کا تیل ہوں۔ کیروسین ہوں۔ نواب کاشمیری ہوں۔۔۔۔ کاشمیری میں بھی ہوں۔ لیکن اتنا ظالم نہیں، جتنا کہ وہ تھا۔ اس لئے کہ اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔۔۔

میں بھی کشمیری ہوں۔۔۔ مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے۔ لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے برا سلوک کریں۔

میں نواب مرحوم کے فن کا قائل ہوں۔ میں اسے بہت بڑا فن کار مانتا ہوں۔ لیکن جب بھی میں نے اسے اسکرین پر دیکھا تو مجھے گھاسلیٹ (مٹی کے تیل) کی بو آئی۔ خدا کرے، اسے دوزخ نصیب ہو، کہ وہاں وہ زیادہ خوش رہے گا۔

لاؤڈ اسپیکر

اگر کسی اسٹوڈیو میں آپ کو کسی مرد کی کی بلند آواز سنائی دے۔ اگر آپ سے کوئی بار بار ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتے ہوئے بڑے اونچے سروں میں بات کرے' یا کسی محفل میں کوئی اس انداز سے بول رہے ہیں' جیسے وہ سانڈھے کا تیل بیچ رہے ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ وہ حکیم احمد شجاع صاحب کے فرزند نیک اختر مسٹر انور کمال پاشا ہیں۔

انور کمال پاشا کا نام جب میں نے پہلی مرتبہ کسی اخبار میں دیکھا تو میرا دماغ اس انور پاشا کی طرف چلا گیا جو "ترکیہ" کا ہیرو تھا۔ بچپن میں ہم یہ پنجابی گانا گایا کرتے تھے۔

مصطفیٰ کمال دے تیریاں دور بلایاں
کر بکرے یونانی حلال دے بیبا وانگ قصایاں
نال تیری ہووے انور دی گھوڑی

آگے یاد نہیں رہا کیا تھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا اور انور پاشا دونوں نے مل کر ہزاروں یونانی بکرے

حلال کئے۔ لیکن بعد میں ان دونوں میں چپقلش شروع ہو گئی اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

میرا خیال ہے انور کمال پاشا نے ان دونوں شخصیتوں کو ذہنی طور پر متحدہ کرنے کے لئے یہ نام اختیار کیا۔ ہو سکتا ہے کوئی اور مصلحت پیش نظر رہی ہو۔ لیکن اگر آپ انور کمال پاشا صاحب کو دیکھیں تو ان میں نہ تو مصطفیٰ کمال پاشا سا بھیڑیا پن ہے (مورخ کمال اتاترک کو "گرے ولف" کہتے تھے) اور نہ انور پاشا کا سا تیکھا حسن ـــــ وہ میراا مطلب ہے انور کمال پاشا' یا تو بھیڑیئے بننے کی کوشش میں بھیڑبن کر رہ گئے ہیں' یا حسین بننے کی کوشش میں تھک ہار کر اپنے ہی خدوخال پر قناعت کر گئے ہیں۔

بہرحال کچھ بھی ہو' قیاس آرائیوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ انور کمال پاشا کی شخصیت منفرد ہے۔ وہ انور پاشا کی آنکھوں کا بھیڑیا پن نہیں تو ان مں ایک ہلکی سی چمک ضرور ہے' جو ظاہر کرتی ہے کہ وہ دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

جسمانی قوت تو خیر ان میں اسی قدر ہو گی' جتنی میرے جسم ناتواں میں ہے مگر وہ میری طرح دھونس جما کر اس کمی کو پورا کر ہی لیتے ہیں۔

فلمی دنیا میں دراصل بلند بانگ دعوے ہی با اثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک محاورہ ہے۔ "پدرم سلطان بود" لیکن اس کے برعکس انور کمال پاشا ہمیشہ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ میرا باپ سلطان نہیں گڈریا تھا۔ سلطان تو میں ہوں۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ نفی اکثر اوقات کارگر اور باا ثر ثابت ہوتی ہے۔
میرا خیال ہے کہ انور کمال پاشا نفسیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اسی لئے وہ اس گر کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی ہے، لیکن ان کا الو سیدھا ہوتا رہا ہے۔

وہ اپنے باپ کے ناخلف بیٹے نہیں۔ لیکن دنیوی کاروبار کے لئے دوسروں پر اپنا رعب جمانے کے لئے شاید وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حسب ضرورت اپنے والد محترم کے متعلق یہ کہہ دیں کہ وہ تو جاہل مطلق ہیں اور ان کے والد محترم کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ ہزارہا پاپڑ بیلنے کے بعد اتنا جان گئے ہیں کہ میرا فرزند نیک اختر مجھے جاہل مطلق بنا کر ایک ایسی سیڑھی تعمیر کر رہا ہے، جس کے ذریعے سے اسے بام عروج پر پہنچنا ہے۔

ابھی اس سیڑھی کے تمام زینے مکمل نہیں ہوئے، لیکن امید ہے کہ جلد ہو جائیں گے۔ اس لئے انور کمال پاشا بہت ممکن ہے کسی رسی کو کھڑا کر کے عرش تک پہنچ جائے اور نامکمل سیڑھی کو حیرت زدہ چھوڑ جائے۔

اس میں شعبدہ بازی کے جراثیم موجود ہیں۔ جس طرح مداری اپنے منہ سے فٹ بال کی جسامت کے بڑے بڑے گولے نکالتا ہے، اسی طرح وہ بھی کوئی اس قسم کا سٹنٹ کر سکتا ہے۔

لیکن مجھے حیرت ہے اور یہ حیرت اس لئے کہ وہ چالاک نہیں، دغا باز نہیں۔ لیکن پھر بھی جب لوگ اس کے منہ سے فٹ بال جتنے گولے باہر

نکلتے دیکھتے ہیں تو کچھ عرصے کے لئے اس کی ساحری سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے، بعد میں وہ اپنی حماقت پر افسوس کریں کہ یہ تو محض فریب نظر تھا۔ یا گولے نکالنے میں کوئی خاص ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ انور کمال پاشا اس دوران میں کوئی اور شعبدہ ایجاد کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنا دوسرا فلم بنانے کے لئے سرمایہ داروں سے، بہت ممکن ہے کہہ رہا ہو، کہ اب کے ایسا فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں جو ہالی وڈ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس میں کوئی ایکٹر ہو گا نہ ایکٹرس۔ صرف کاٹھ کی پتلیاں ہوں گی جو بولیں گی، گانا گائیں گی اور ناچیں گی بھی---

اور کلائمکس اس کا یہ ہو گا کہ وہ گوشت پوست کی بن جائیں گی۔

انور کمال پاشا پڑھا لکھا ہے۔ ایم۔ اے ہے۔ انگریزی ادب سے اسے کافی شغف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فلموں کی کہانی اسی سے مستعار لیتا ہے۔ اور حسب ضرورت یا حسب لیاقت اردو زبان میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے فلموں کے کردار ہمیشہ ڈرامائی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خود ڈرامائی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے کہ اس کے والد محترم جناب حکیم احمد شجاع صاحب کسی زمانے میں اچھی خاصے ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ۔ "باپ کا گناہ" بہت مشہور ہے۔

ایک لطیفہ سنئے۔ انور کمال پاشا کے متعلق کسی جگہ گفتگو ہو رہی

تھی۔ اس دوران میں ایک صاحب نے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا کہا "جی' میں انور کو جانتا ہوں' وہ باپ کا گناہ ہے"۔

انور کمال پاشا' بہرحال بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اتنا بولتا ہے۔ کہ ان کے مقابلے میں اور کوئی نہیں بول سکتا۔ اصل میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اپنی آواز خود سننا چاہتا ہے اور دل ہی دل میں داد دیتا ہے کہ واہ انور کمال' تو نے آج کمال کر دیا۔ تیرے مقابلے میں اور کوئی اتنا زبردست مقرر نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ انسانی نفسیات کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بعض انسانوں کو یہ مرض ہوتا ہے کہ وہ ریکارڈ بن جائیں اور انہیں گرامون کی سوئی ـتلے رکھ کر ہر وقت سنتے رہیں۔ انور کمال پاشا بھی اس زمرے میں آتا ہے۔

اس کے پاس اپنی گفتگوؤں کے کئی ریکارڈ ہیں جو اپنی زبان کی سوئی کے نیچے رکھ کر بجانا شروع کر دیتا ہے اور جب سارے ریکارڈ بج چکتے ہیں تو وہ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سننے والے بچوں کے مانند خوش ہو کر محفل سے چلا جاتا ہے۔ اس کے خیالات میں (Fiocoation) کو بہت زیادہ دخل ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ یہ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ اس کے اکثر فلموں میں دریا ضرور آئے گا۔ اس میں ضرور کوئی ڈوبے گا۔

اس نے اب تک مندرجہ ذیل فلم بنائے ہیں۔ جن میں سے کچھ کامیاب رہے اور کچھ ناکام۔ "دو آنسو" "دلبر" "غلام" "گھبرو" اور

"گمنام"۔

اگر آپ نے یہ فلم دیکھے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کتنے فلموں میں دریا آتا ہے جس میں اس کی کہانیوں کے کردار گرے ہیں۔ لیکن وہ موت کا قائل نہیں۔ وہ ان کو دریا میں گراتا ضرور ہے، مگر بعد میں بتاتا ہے کہ وہ ڈوبا نہیں تھا۔ یعنی مر نہیں گیا تھا۔ کسی نہ کسی ذریعے سے (جو انور کمال پاشا کے اپنے دماغ کی عجیب و غریب تخلیق ہوتا ہے) زندہ رہا تھا۔ معلوم نہیں میں کہاں تک صحیح ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انور کمال پاشا کی زندگی بھی شاید ڈوب ڈوب کر زندہ رہنے سے دوچار رہی ہے۔

اس نے اپنی زندگی میں کئی ندیاں پار کی ہیں۔ ایک تو وہ تھی جو سہرے جلوے کی بیاہی ہوئی تھی۔ اس کو پار کرنے میں تو خیر اس کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ مگر جب اس کے سامنے وہ ندی جس کا نام شمیم تھا۔ بمبئی سے بہتی ہوئی لاہور آئی تو اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ماہر تیراک کے مانند اسے بھی پار کر گیا۔

اس کو بہت دیر سے فلم بنیٔ کا شوق تھا۔ بعد میں یہ شوق اس دھن میں تبدیل ہو گیا کہ وہ ایک فلم بنائے۔

جب شمیم سے اس کی راہ و رسم ہوئی تو اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور لاؤڈ سپیکر بن کر ہر طرف گونجنے لگا "کہ آؤ میں فلم بنانا چاہتا ہوں۔ ہے کوئی سخی ایسا جو مجھے سرمایہ دے"۔

اس کی مسلسل صدا پر آخر کار اسے سرمایہ مل گیا۔ شمیم بمبئی میں

ایک ایسی ندی تھی جس کا پانی بہت صاف ستھرا تھا۔ اس میں کئی خواص تیر چکے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ پانی پتھر کی طرح ٹھہر گیا۔ اس لئے تیراکوں کے لئے وہ دلچسپی کا سامان نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنے وطن لاہور میں آنا پڑا۔

خیر اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ کوئی اصول اور لگا بندھا قاعدہ تو نہیں۔ لیکن عام طور یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ فلم ڈائریکٹر' عورت کے ذریعے ہی سے آگے بڑھتے ہیں اور پیچھے بھی اس کی وجہ سے ہٹتے ہیں اور ایسے ہٹتے ہیں' یا ہٹائے جاتے ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

پاشا نے تھوڑی دیر کے بعد شمیم سے شادی کر لی جو اپنا تنگ ماتھا' چوڑا کرنے کے لئے قریب قریب ہر روز اپنے بال موچنے سے نوچتی رہتی تھی۔ پاشا نے اس کی خوشنودی خاطر کے لئے ضرور مصنوعی طور پر اپنے سارے پر و بال نوچ کی اس کے سامنے پلیٹ میں رکھ دیئے ہوں گے۔

میں اب اپنے لمبے مضمون کو مختصر کرنا چاہتا ہوں' اس لئے کہ میں انور کمال پاشا کی طرح طوالت پسند نہیں ہونا چاہتا۔ وہ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک ہے اور اس شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ہٹ دھرم بھی ہے اور تلون مزاج بھی۔ بکواسی بھی اور بعض اوقات سنجیدہ مزاج بھی۔

اس کے کردار میں جو میں نے خاص بات دیکھی وہ یہ ہے کہ وہ مغلئی ٹھاٹ کا آدمی ہے۔ اس کی طبیعت میں آجائے تو وہ آپ کا منہ موتیوں سے بھر دے گا اور اگر وہ "موڈ" میں نہیں ہے تو وہ آپ سے کوئی بات نہیں

کرے گا۔

میں آپ کو اختتامی طور پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں آج سے کچھ عرصہ پہلے شاہ نور اسٹوڈیو میں تھا' جہاں انور کمال پاشا اپنے فلم "گمنام" کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا' ٹائپ رائٹر میز پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا/ کہ پاشا اپنی کار سے اترا اور میرے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

"منٹو صاحب میں ایک سخت الجھن میں گرفتار ہوں"۔

"میں نے اپنے خیالات جھٹک کر پوچھا۔۔۔ "کیا الجھن ہے؟"

اس نے کہا "یہ فلم جو میں بنا رہا ہوں اس میں ایک مقام پر اٹک گیا ہوں۔ آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں' ممکن ہے آپ عقدہ کشائی کر سکیں"۔

میں نے اس سے کہا "میں حاضر ہوں فرمایئے! آپ کہاں اٹکے ہوئے ہیں"۔

اس نے مجھے اپنے فلم کی کہانی سنانا شروع کی۔ دو سین تفصیل سے اس انداز میں سنائے' جیسے پولیس جیپ میں بیٹھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے راہ چلتے لوگوں کو ہدایت کر رہی ہے کہ انہیں بائیں ہاتھ چلنا چاہئے۔ میں اپنی زندگی میں ہمیشہ الٹے ہاتھ چلا ہوں' اس لئے میں نے پاشا سے کہا۔

"آپ کو ساری کہانی سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ

آپ کس گڑھے میں پھنسے ہوئے ہیں"۔

پاشا نے حیرت آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"آپ کیسے سمجھ گئے؟"

میں نے اس کو سمجھا دیا اور اس کی مشکل کا حل بھی بتا دیا۔ جب اس نے میری تجویز سنی تو اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

"ہاں کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے"۔

میں ذرا چڑ سا گیا۔ "حضرت اس سے بہتر حل آپ کو اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ مصیبت یہ ہے کہ میں فوری طور پر سوچنے کا عادی ہوں۔ اگر میں نے یہی حل آپ کو دس بارہ روز کے بعد پیش کیا ہوتا تو آپ نے کہا ہوتا کہ سبحان اللہ۔ مگر اب کہ میں نے چند منٹوں میں آپ کی مشکل آسان کر دی ہے تو آپ کہتے ہیں۔ "ہاں کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو شاید اس مشورے کی قیمت معلوم نہیں"۔

پاشا نے فوراً اپنے پروڈکشن مینجر کو بلایا۔ اس سے چیک بک لی اور اس پر کچھ لکھا۔ چیک پھاڑ کر بڑے خلوص سے مجھے دیا۔

"آپ یہ قبول فرمائیں"۔

اس کے اصرار پر میں نے یہ چیک لے لیا--- جو پانچ سو روپے کا تھا---

یہ میری زیادتی تھی۔ اگر میں آسودہ حال ہوتا، تو یقیناً میں نے یہ

چیک پھاڑ دیا ہوتا۔لیکن افسوس انسان بھی کتنا ذلیل ہے یا اس کے حالات زندگی کتنے افسوس ناک ہیں کہ وہ گراوٹ پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں اب مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ انور کمال اپنی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی سے بچے پیدا کرتا ہے جن کی نگہداشت شمیم کرتی ہے۔ وہ ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے اور انور کمال پاشا انجن ڈرائیور ہے، جو اس کے پیٹ میں ایندھن جھونکتا رہتا ہے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریل گاڑی کے انجن کی ایسی سیٹی ہے جو رات کی خاموش فضا میں "فیڈ آؤٹ" ہو رہی ہے۔

سعادت حسن منٹو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دور نہیں جا سکتے اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھوا ہے، چکھا ہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پرواہ نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

"منٹو آدم کی جراتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے ــــــ وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کے باوجود، خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں

مکتبۂ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور ۲۵